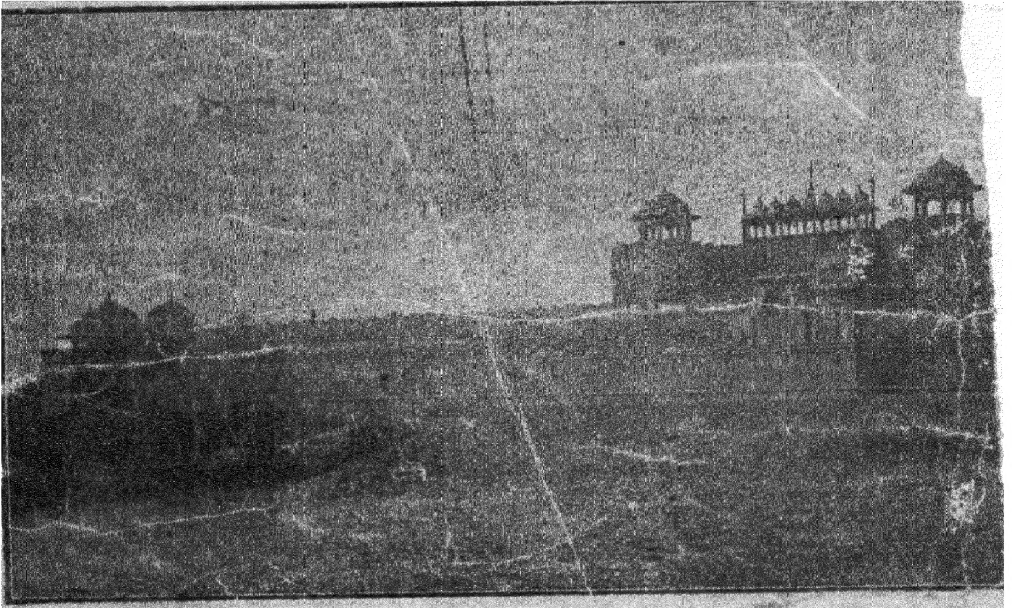
بابت جنوری ۱۹۲۳ء

حصّہ نہم

اُردو



انجمن ترقّی اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

تنقید شعر العجم

(نمبر ۲)

فردوسی

(از جناب محمود شیرانی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

فردوسی کے حالات کے لئے ہمارے پاس قدیم و جدید متعدد ذرائع موجود ہیں لیکن ان میں جو زیادہ اہمیت رکھتے ہیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) شاہنامہ۔ اِس کتاب میں بعض موقعوں پر شاعر کے حالات مل جاتے ہیں (۲) دیباچۂ قدیم شاہنامہ اِس دیباچہ کی تاریخ تحریر سے ہم ناواقف ہیں۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ وہ فردوسی سے دو ایک صدی بعد لکھا گیا ہے لیکن اس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں (۳) نظامی عروضی نے منتصف قرن ششم میں اپنا چہار مقالہ لکھا اِس میں فردوسی کے حالات بھی مختصراً ملتے ہیں۔

برخلاف دیگر مشاہیر کے فردوسی کے حالات کے متعلق ہر وقت اور ہر زمانہ میں تلاش و جستجو رہی ہے اور ہر عصر میں کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے اس لحاظ سے فردوسی خوش نصیب کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ لیکن ایک نقص یہ واقع ہو گیا ہے کہ جہاں دیگر مشاہیر کے حالات سرے سے ملتے ہی نہیں وہاں فردوسی کے متعلق واقعات کا ایک انبار موجود ہو گیا ہے۔ ہر قسم کی روایات جھوٹی سچی باتوں تاریخ اور افسانہ نے ہمارے شاعر کے سوانح کو اپنی جولانیوں کا میدان بنا لیا ہے۔ اِس لئے فردوسی کے واقعہ نگار کو اگر کوئی اصلی شکایت ہے تو واقعات کی قلت نہیں اور

غیر حاضری کے باعث سے نہیں ہے بلکہ ان کی افراط اور کثرت تنوّع کی بنا پر کیونکہ متخالف و متناقض روایات کا سلسلہ اس کو بیحد پریشان کرتا ہے اور وہ شبلی کے ہمزبان ہو کر بول اُٹھتا ہے "ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے" اس لئے اس کا فرض ہے کہ جب وہ فردوسی ادبیات میں گھسے تو صحیح کو باطل سے حقیقت کو مجاز سے اور تاریخ کو افسانہ سے تمیز کرنے کے لئے متقدمین میں سے کوئی نہ کوئی بدرقہ ساتھ لے لے، تن تنہا اس دشوار گزار راستہ کو طے کرنے میں بھٹک جانے کا احتمال ہے۔

اِن دشواریوں کا احساس کر کے پروفیسر برون نے فردوسی کے حالات لکھتے وقت اپنے لئے دو رہبر تجویز کر لئے پہلا نظامی عروضی سمرقندی اور دوسرا دولت شاہ جو اواخر قرن نہم ہجری کا مصنّف ہے۔ صورت حالات میں برون کا انتخاب قریب قریب مناسب اور موزوں تھا۔ لیکن جب برون کی تاریخ ادبیات ایران علاّمہ شبلی کی نظر سے گزری تو ایک بے محل اور غیر ضروری خفگی کا اظہار فرمایا۔ ایک خط میں جو اپنے دوست مہدی حسن صاحب کے نام گیارہ اپریل ۱۹۰۶ء کو لکھا گیا تھا فرماتے ہیں:-

> "بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ برون کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے
> برادر اسحاق سے پڑھوا کر بھی سنا خود بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فردوسی کی نسبت صرف دو تین
> صفحے لکھے ہیں جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں مذاق اتنا صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ
> سبعہ معلقہ کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کسی حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارس کے
> کلام کے برابر نہیں میں مع سود او رہرجہ کے آپ سے دام لوں گا۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ
> شبلی گیارہ اپریل ۱۹۰۶ء"

(مکاتیب شبلی صفحہ ۲۴۲ معارف پریس اعظم گڑھ)

یورپ کے نہایت مشہور فاضل اور مستند مستشرق کی نسبت جس نے اپنی تمام عمر فارسی ادبیات اور ایران کی خدمت میں واقف کر دی ہے اور اپنی تصنیفات اور تالیفات سے تمام فارسی خواں دنیا کو رہین منّت کر دیا ہے جس کی فضیلت اور علم کے تمام ایرانی قائل ہیں ہندوستان کے معروف ادیب کی یہ رائے پڑھ کر میں ایک سناٹے میں آ گیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ رائے، کن مقولوں پر محمول کیجائے۔ شبلی عالم بے بدل سہی لیکن ان کی یہ تنگ چشمی اور کوتاہ

نظری ہمیشہ افسوس کے ساتھ یاد کئے جانے کے قابل ہی۔

اگر تاریخ ادبیات ایران سوقیانہ اور عامیانہ ٹھیری تو میں نہیں کہہ سکتا کہ شعرالعجم کو پھر کون سی صف میں جگہ ملے گی۔ سچ تو یہ ہی کہ مولانا کی رائے میں واقعیت اسی درجہ تک موجود ہی جس درجہ تک ایک شاندار شاعرانہ مبالغہ میں ہوتی ہے۔ مولانا شبلی کا مذاق اتنا صحیح ہے کہ سخندان فارس مولانا آزاد مرحوم کو برون کی تصنیف سے بہتر مانتے ہیں انھیں مہدی حسن صاحب کے نام ایک اور خط میں فرماتے ہیں:-

"برون کی کھتونی سے کہیں بہتر ہے"۔ (مکاتیب شبلی صفحہ ۲۴۲)

شعر فہمی عالم بالا معلوم شد۔ شبلی کا اس جوش و ہیجان کے ساتھ برون کو اپنے ناوک بیداد کا ہدف بنانے میں خدا جانے کیا اصرار ہی۔ برون کی تصنیف میرا دل خوش کن مطالعہ رہی ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ استفادہ کیا ہی یہ کتاب اپنے فن میں بیحد مفید اور کارآمد ہی اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس وقت تک اس سے بہتر کوئی تصنیف اس جامعیت کے ساتھ کسی زبان میں موجود نہیں برون نے جو دشوار گزار اور کٹھن منزل طے کی ہی شبلی اس کے مرد میدان نہیں ہو سکتے۔

لیکن ناظرین کو یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ آخر پروفیسر برون نے وہ کون سا قصور کیا تھا جس کے لئے بارگاہ شبلی سے اس قدر مخذول و معتوب بنائے گئے۔ برون نے اپنی تاریخ ادبیات ایران (صفحہ ۱۴۲ طبع ۱۹۰۶ء) میں فردوسی کے شاہنامہ کے متعلق الفاظ ذیل میں رائے دی ہی۔

"اس عظیم الشان نظم کی ادبی وقعت و قابلیت کا نہایت اعلیٰ پیمانہ پر اندازہ کرنے میں مشرقی اور مغربی محققین قریب قریب متفق ہیں اس لئے میں بڑے تذبذب اور تردد کا احساس کر کے معترف ہوں کہ میں اس جوش و ہیجان میں شریک ہونے کے ناقابل ہوں میری رائے میں شاہنامہ سبعہ معلقہ کی مساوات پر بھی نہیں آسکتا۔ اگرچہ یہ مثنوی ممالک اسلام میں تمام رزمیہ نظموں کے لئے نمونہ اور مثال بن گئی ہے میرے خیال میں خوبی بیان نزاکت جذبات اور حسن ادا میں فارسی زبان کی بہترین حکمیہ قصصیہ اور غزلیہ نظموں کی ہمردیف نہیں بن سکتی بیشک ذوق اور وجدان کے معاملوں میں بحث و مباحثہ کرنا خصوصاً ادبیات کے شعبہ میں

تقریباً طول ال ہے۔ شاہنامہ کی قدرشناسی کے بارہ میں غالباً میرا قصور کسی قدر اِس
قدرتی عجز کی بنا پر بھی ہے جس کی وجہ سے میں بالعموم رزمیہ اشعار کو پسند کرنے سے قاصر
ہوں۔ ان خامیوں سے ہم سب واقف ہیں خاص کر موسیقی میں جہاں واگنر کا ایک سرود بعض کو
بالکل محو اور دارفتہ بنا دیتا ہے اور بعض کو بالکل بے تعلق چھوڑ دیتا ہے بلکہ اُلٹا ناخوش کر دیتا ہے۔"

مولانا شبلی اور پروفیسر برون کے بیانات میں جو فرق ہے اِس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں
برون نے سبعہ معلقہ کو ترجیح دیتے ہوئے ساتھ ہی نیک نیتی کے ساتھ یہ اقرار بھی کر لیا ہے کہ میں شاہنامہ
کی حقیقی داد دینے سے معذور ہوں۔ برون کا دوسرا قول کہ شاہنامہ سے بہتر فارسی زبان میں اور نظمیں بھی
ہیں شبلی اِس موقعہ پر ہٹ دھرمی کر جائیں تو دوسری بات ہے ورنہ نظامی اور فردوسی کے مقابلہ میں اُنھوں نے
صاف نظامی کی افضلیت تسلیم کی ہے۔

ہمارا مشرقی مذاق انتہا پسند واقع ہوا ہے عطریات میں ہم تیز بُو والے عطر پسند کرتے ہیں۔ کھانوں میں
چٹ پٹی یا کثرت سے شیریں اشیا ہمیں مرغوب ہیں لباس میں بھڑک جائز سمجھتے ہیں اسی طرح تاریخ بھی وہی
پسند کرتے ہیں جس میں قصّے بھی ہوں۔ اِس کی کبھی پروا نہیں کرتے کہ یہ افسانہ ہیں یا واقعہ۔ شبلی نے ملکی مذاق
کی طبعیت میں فردوسی کے حالات قلمبند کرتے وقت اِسی قسم کے ذرائع تلاش کئے جو ہم خرما و ہم ثواب کا
مصداق ہوں۔ نظامی عروضی اور دولت شاہ کے علاوہ مولانا کے پاس سب سے بہتر جو سند ہے وہ دیباچہ بائیسنغری
ہے۔ اگر برون کی تقلید میں پہلے دو مصنّفین پر ہی اکتفا کرتے تو شاید مولانا کم ٹھوکریں کھاتے لیکن دیباچہ
بائیسنغری ان کے مذاق کی چیز تھی اِس کو دیکھکر ایسے مفتون ہوئے کہ فردوسی کے حالات میں الف سے
لے کر یا تک چند موقعوں کے سوا دیباچہ ہی اِن کے پیش نظر رہا اور اِس کے زیادہ دلچسپ مقامات کو
جن کا زیادہ لغو ہونا بھی ظاہر ہے دل کھول کر نقل کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ شعر العجم میں فردوسی کا تاریخی حصّہ
قریب قریب ناقابل اعتبار ہے۔ ان چند مراتب کے بعد میں شعر العجم کا مطالعہ شروع کرتا ہوں۔

فردوسی کے نام کے لئے شبلی فرماتے ہیں :-

حسن بن اسحٰق بن شرف نام اور فردوسی تخلص تھا دولت شاہ کا بیان ہے کہ کہیں کہیں وہ

اپنا تخلص ابن شرف شاہ بھی لاتا ہے مجالس المومنین میں بعض مورخوں کے حوالہ سے اس کے باپ کا نام منصور بن فخر الدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا ہے۔" (شعر العجم صفحہ ۹۳)

خدا جانے مولانا نے صاحب مجالس المومنین کو کیوں کانٹوں میں گھسیٹا۔ قاضی صاحب کے اصلی الفاظ یہ ہیں

"بعضے گفتہ اند کہ او منصور بن فخر الدین احمد ابن مولانا فرخ الفردوسی است"

یعنی قاضی صاحب کے نزدیک فردوسی کا ہی نام منصور ہے نہ اس کے باپ کا۔ فردوسی کے نام کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ تاریخ گزیدہ میں حسن بن علی، دولت شاہ کے ہاں حسن بن اسحٰق دیباچہ بایسنغری میں منصور بن احمد، مجالس المومنین میں منصور بن احمد ہے۔ لیکن اس باب میں سب سے بہتر مدار علیہ دیباچہ قدیم شاہنامہ ہے جس کا بیان ہے۔

"پدر فردوسی دو فرزند داشت یکے حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی و یکے مسعود"

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

"وطن میں بھی اختلاف ہے چہار مقالہ میں ہے کہ طبرستان کی نواحی میں باژ نام ایک گاؤں تھا فردوسی یہیں کا رہنے والا تھا" (شعر العجم صفحہ ۹۳)

جب ہم چہار مقالہ کو اٹھا کر دیکھتے ہیں تو اس میں صاف لکھا ہے۔

"استاد ابوالقاسم فردوسی از دہاقین طوس بود از دیہے کہ آں دیہہ را باژ خوانند واز ناحیت طبران است" (طبع یورپ صفحہ ۴۷)

اب کہاں طبرستان اور کہاں طبران، علامہ شبلی کو سخت غلط فہمی واقع ہوئی ہے۔ شمالی ایران کا وہ کوہستانی علاقہ جو بحیرۂ خزر پر واقع ہے طبرستان کہلاتا تھا حدود دامغان سے لے کر کوہستان رے تک سب طبرستان میں شامل تھا اور وسیع معنوں میں اس کا اطلاق والمرز یعنی گیلان، ماژندران، دیلمان، رستم دار اور جرجان پر ہوتا تھا۔ طبران یا طابران طوس کے ایک شہر کا نام ہے طوس میں دو شہر شامل تھے اور مجموع طوس کہلاتا تھا پہلے شہر کا نام طبران اور دوسرے شہر کا نام نوقان تھا۔ ابوالفضل بیہقی کے ہاں طابران کا ذکر آتا ہے۔ "پس بدیں عزم سوے طابران طوس برفت" (صفحہ ۷۵۶)

فرماتے ہیں :-

"سنہ ولادت معلوم نہیں البتہ سال وفات ۴۱۱ھ ہے اور چوں کہ عمر کم از کم اسی برس کی تھی جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے ؎

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد — امیدم بہ یکبارہ برباد شد

اس لئے سال ولادت تقریباً ۳۲۹ھ سمجھنا چاہیئے" (شعر العجم ص ۹۳ و ۹۴)

جب چار سو گیارہ سے اسی تفریق ہوئے تو حاصل تفریق ۳۳۱ھ ہے نہ ۳۲۹ھ۔ شعر بالا سے بھلا کون شخص یقین کر سکتا ہے کہ فردوسی نے اسی سال کی عمر میں وفات پائی ۔ ۔ ۔ ۔ کیا اس عمر کے بعد گلزار عالم کی ہوا کھانا فردوسی کے لئے ممنوع تھا نہ وہ اپنی عمر ہشتاد بتا رہا ہے بلکہ نزدیک ہشتاد کہتا ہے۔ شعر مذکورۂ بالا خاتمۂ شاہنامہ میں آتا ہے اور خاتمہ ۴۰۰ھ میں مرقوم ہوا تھا۔ چنانچہ یہ شعر ؎

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار — کہ گفتم من این نامۂ شہریار

مولانا کا یہ عقیدہ تسلیم کر کے کہ فردوسی کا انتقال اسی برس کی عمر میں ہوا۔ اس کا سال ولادت معلوم کرنے کے لئے چار سو میں سے ہشتاد کی تفریق کرنا ہوگی جس سے سال ولادت ۳۲۰ھ برآمد ہوتا ہے نہ ۳۲۹ھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰۰ھ میں فردوسی اپنی عمر کا اٹھتر واں دور ختم کر رہا تھا۔ اس لئے کہ اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال جب ۳۷۰ھ ہوگا وہ شاہنامہ شروع کرتا ہے اڑتالیس اور تیس (مدت شاہنامہ) اٹھتر ہوتے ہیں ۳۸۸ھ میں (سلطان محمود کی تخت نشینی کا سال) فردوسی چھیاسٹھویں سال میں تھا بارہ اور چھیاسٹھ اٹھتر ہوتے ہیں جس طرح ۳۸۸ اور ۱۲ چار سو ہوتے ہیں۔ فردوسی کی ولادت اس لئے ۳۲۲ھ و ۳۲۳ھ کے درمیان قرار پاتی ہے۔

اس کے بعد شبلی فردوسی کے باپ کا ایک خواب نقل کرتے ہیں جس کی تاویل نجیب الدین معبر بیان کرتا ہے۔ اصل میں اس قصہ کا بانی دیباچۂ بایسنغری ہے اس سے پیشتر اس کی سراغ رسانی نہیں کی جا سکتی۔ یہ دیباچہ ۸۲۹ھ میں تصنیف ہوا ہے اور اس امر میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے قصوں کا تعلق فردوسی کی حقیقی تاریخ سے بہت کم ہے وہ ایسے زمانہ کی یادگار ہیں جب کہ فردوسی کے متعلق اصلی تاریخ کی غیر حاضری

میں افسانے اور قصص شائع ہونے لگے ہیں :-

قولہ "چوں کہ آبائی پیشہ زمینداری تھا اور جس گاؤں میں سکونت تھی خود اس کے ملک میں تھا اس لئے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا" (شعر العجم صفحہ ۹۴)

نظامی کی سند پر عبارت بالا نقل کی گئی ہے لیکن اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

"فردوسی در آں دیہہ شوکتے تمام داشت چنانکہ بدخل آں ضیاع از امثال خود بے نیاز بود" (چہار مقالہ صفحہ ۴۷)

نظامی فردوسی کو گاؤں کا مقتدر شخص مانتا ہے لیکن مولانا نے وہ گاؤں ہی اس کو عنایت کر دیا۔ فردوسی کی آسودگی اور فارغ البالی کا قصہ میرے خیال میں بے بنیاد معلوم ہوتا ہے اور شاہنامہ میرے اس خیال کا موید ہے۔ شاعر کئی موقعوں پر اپنی تنگدستی کا شاکی ہے۔ چنانچہ ؎

(۱) دو دیگر کہ گنجم وفادار نیست — مرا ایں رنج را کس خریدار نیست (شاہنامہ جلد اول صفحہ ۳)

(۲) مرا دخل و خورار برابر بدے — زمانہ مرا چوں برادر بدے

(شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۱۲۷۰ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۳) نماندم نمکسود و ہیزم نہ جو — نہ چیزے پدید است تا جو درو

بدیں تیرگی روز و ہولِ خراج — زمیں گشت از برف چوں گوی عاج

من اندر چنیں روز و چندیں نیاز — باندیشہ درگشتہ فکرم دراز

ہمہ کارہا شد سر اندر نشیب — مگر دست گیرد حسینِ قتیب [1]

اس سے ظاہر ہے کہ شاعر حسین قتیب سے اپنی زمین کا حاصل ادا کرنے کی استدعا کرتا ہے۔

قولہ "فردوسی نے وطن ہی میں شاہنامہ کی ابتدا کی اور ابو منصور نے جو طوس کا صوبہ دار تھا اس کی سرپرستی کی ابو منصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل ارسلان جاذب ہوا چوں کہ شاہنامہ کا اب ہر جگہ چرچا پھیلتا جاتا تھا، سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی

---

[1] شاہنامہ جلد سوم صفحہ ۱۱۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ

سلان خاں کے نام حکم پہونچا کہ فردوسی کو دربار میں بھیجدو فردوسی نے پہلے تو انکار کیا لیکن پھر شیخ معشوق کی پیشین گوئی یاد آئی اس لئے راضی ہو گیا۔" (شعر العجم صفحہ ۹۵)

اس عبارت میں کئی امور دامنگیر تامل ہیں شبلی اس عامل طوس کا نام یہاں ابومنصور لکھتے ہیں لیکن صفحہ ۱۱ پر منصور بن محمد بتاتے ہیں اور اس اختلاف کی کوئی توجیہ بھی بیان نہیں کرتے۔ فردوسی خود اس کا نام نہیں لیتا ٹرنر میکن اپنے شاہنامہ کی سرخی میں منصور بن محمدؐ لکھتا ہے۔ یہ قول کہ ابومنصور کے بعد سلان خاں عامل طوس ہوا غلط معلوم ہوتا ہے۔ یہ منصور بن محمدؐ یا ابومنصور یا مہتر گردن فراز (جیسا کہ فردوسی لکھتا ہے) اگر واقع میں عامل طوس تھا تو ۳۷۰ھ کے قرب وجوار میں جب کہ شاہنامہ کی ابتدائی منازل طے ہو رہی تھیں وفات پا چکا ہے ان ایام میں طوس یا خراساں کا آل غزنہ سے کوئی علاقہ نہیں تھا اور خراسان ابوعلی سیمجوری حسام الدولہ تاش اور فایق کے حملوں کی جولانگاہ بن رہا تھا اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ منصور بن محمدؐ سیمجوریوں کا کوئی ملازم یا ماتحت ہوگا اسی وجہ سے فردوسی نے اس کا نام جب شاہنامہ سلطان محمود کے نام منسوب کیا شاہنامہ سے خارج کر دیا سیمجوریوں اور غزنویوں کی رقابت سب کو معلوم ہے اور خراسان کے لئے ان کی زور آزمائیاں تاریخ میں مسطور ہیں۔ جب میں نے سلان خاں کا نام پڑھا تو بہت حیران ہوا کہ یہ پٹھان بھائیوں کا سا نام غزنوی تاریخ میں کہاں سے نکل آیا۔ دیباچہ بایسنغری میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ ارسلاں خاں ہے لیکن آخری حصہ پھر بھی کھٹکتا رہا۔ کیونکہ ان ایام میں خان کا استعمال شاہان ترک کے نام سے تعلق رکھتا تھا۔ آخر تاریخ میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ارسلان خاں اصل میں ارسلان جاذب ہے جو سلطان محمود کا غلام اور مشہور و معروف جنرل تھا۔ یہ شخص بقول عتبی ۳۸۹ھ میں طوس کا عامل مقرر ہوا۔ ۳۷۰ھ اور ۳۸۹ھ کے درمیان طوس پر خدا جانے کتنے انقلاب آئے ہیں اور کتنے عامل بدلے گئے ہیں۔ محمود کا فردوسی کو دربار میں طلب کرنا قطعاً غلط ہے۔ شیخ محمدؐ معشوق طوسی کا تعلق فردوسی روایات میں قدیمی معلوم نہیں ہوتا اور دیباچہ بایسنغری کے عہد سے شروع ہوتا ہے جو زمانہ درویش پرستی کا عنفوان شباب ہے۔

قولہ "دربار کا میر منشی بریع الدین (کذا) دبیر تھا اس نے عنصری سے کہا کہ بادشاہ کو مدت سے شاہنامہ کی تصنیف کا خیال تھا لیکن دربار کے شعرا میں سے کسی نے اس کی ہامی نہیں بھری

اب اگر فردوسی سے یہ کام بن آیا تو تمام شعرائے دربار کی آبرو خاک میں مل جائے گی عنصری نے کہا بادشاہ سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فردوسی کو اُلٹا پھیر دیجئے لیکن اس کی اور تدبیر کرنا چاہیے چنانچہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ یہاں کا قصد بیفائدہ ہے سلطان کو یوں ہی ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہوا لیکن اُس دن سے آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا۔ اِس لئے حقیقت واقعہ سے آپ کو اطلاع دیدی گئی۔ فردوسی نے ہرات سے واپس جانا چاہا لیکن ساتھ ہی خیال پیدا ہوا کہ شاید اس میں کچھ بھید ہو اتفاق سے عنصری اور بدیع الدین دبیر میں شکر رنجی پیدا ہوئی عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا بدیع الدین ہی کے مشورہ سے لکھا تھا۔ اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً اِدھر کا عزم کیجئے عنصری نے جو لکھا خودغرضی سے لکھا تھا فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں یہ اشعار بھی خط میں درج کئے ؎

بگوش از سروشم بسے مژدہاست — دلم گنج گوہر زباں اژدہاست

چہ سنجد بمیزان من عنصری — گیا چوں کشد پیش گلبن سری (شعر العجم ص ۹۵ و ۹۶)

جسے آنکھوں دیکھے مکھی نگلنا کہا جاتا ہے وہ مولانا شبلی نے بیان کیا ہے۔ اِس قصہ میں رودکی اور عنصری کا نام دیباچہ بایسنغری میں ہر مقام پر ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے حتیٰ کہ ابیات مذکورۂ بالا کے ایک تیسرے شعر میں جس کو مولانا نے دانستہ ترک کر دیا رودکی کا نام یوں لیا گیا ہے ؎

زبیدانشی باشد و کودکی — کہ رائے فزونی زند رودکی

یعنی اِس سازش میں رودکی اور عنصری دونوں شریک و سہیم ہیں۔ مولانا نے جیسا کہ حاشیہ میں ارشاد کرتے ہیں (دیباچہ نویسوں نے عنصری کے ساتھ رودکی کا نام بھی لکھا ہے لیکن رودکی اس سے پہلے ۳۰۴ھ (کذا) میں مر چکا تھا) اس کا نام خارج کر دیا۔ بعض اوقات کسی روایت کی تصدیق یا تردید اور اس کے محک امتحان کے اجزا تاریخی تائید کی غیر حاضری میں اِسی قصہ میں نکل آتے ہیں جن سے ایک محقق کو اپنی تحقیق میں بڑی امداد ملتی ہے اس لئے ہر مؤرخ اپنا فرض جانتا ہے کہ پرانی روایات کو جوں کا توں جیسی اس تک پہونچی ہیں

حوالۂ قلم کر دے اور اپنی طرف سے کوئی تغیر و تبدل ترمیم و اضافہ نہ کرے۔ اِس قصّہ کے راوی نے جس کو تاریخ اور اِس کے فن سے کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی غالباً خاقانی کا یہ شعر ذہن میں رکھکر کہ

شاعر ساحر منم ملک معانی مراست   ریزہ خور خوان من رودکی و عنصری

یہ قیاس مرتّب کیا کہ ان دونوں شاعروں کا ایک زمانہ ہی اور فردوسی کی برتری کا سکہ بٹھانے کے لئے اِس لغو قصّہ کی بُنیاد ڈالی حالاں کہ رودکی و عنصری میں پوری ایک صدی کا فاصلہ ہی۔ رودکی ۳۲۹ھ میں وفات پاتا ہی۔ اور عنصری ۴۳۱ھ میں لہٰذا شبلی کو قصّہ پسند آیا لیکن رودکی کا نام تاریخی مشکلات کی بنا پر کھٹکا چنانچہ اسے کانٹے کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ تاریخ میں اگر اسی قسم کی قطع و برید جائز مانی گئی تو پھر اس کا حشر کیا ہوگا۔ شبلی نے اِس ترمیم سے تنقید کو ایسے افسانوں کے تردید اور بطلان سے اپاہج کر دیا ہی۔ یہ کون سا اصول تاریخ نویسی ہی کہ جو ردی قصّہ نظر پڑے بشرطیکہ کچھ بھی تفریح کے اجزا رکھتا ہو قبول کر لیا جائے ایسا کرنے میں ہم تاریخ نہیں لکھتے بلکہ الف لیلہ میں ایک نئی کہانی اضافہ کرتے ہیں۔ شبلی نے مرقومۂ بالا دونوں شعروں کو فردوسی کی ٹکسال کا مان لیا آخر اس تیسرے شعر نے کیا قصور کیا تھا وہ بھی اسی رنگ میں ہی جس رنگ میں پہلے دو شعر ہیں۔ مجھکو افسوس ہی کہ مولانا شبلی نے ایسے ذلیل قصّوں کو دوہراکر شعر العجم کو یوں داغدار کیا۔ یہ یاد رہی کہ فردوسی اپنی خواہش سے غزنین آیا ہی نہ سلطان محمود کی طلبی پر اِس لئے اِس قصّہ کی اِس کے واقعات زندگی میں کہیں جگہ نہیں ہو سکتی۔

قولہ حُسنِ اتفاق سے دربار کے ممتاز شعرا یعنی عنصری فرخی عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے اور بادہ و جام کا دَور چل رہا تھا۔ فردوسی اُدھر جا نکلا حریفوں نے اِس کو مخل صحبت سمجھکر روکنا چاہا ایک نے کہا کہ اِس کو چھیڑا جائے تو خود تنگ آکر چلا جائے گا۔ عنصری نے کہا یہ تہذیب اور آدمیت کے خلاف ہی۔ آخر رائے قرار پائی کہ رباعی کا ایک مصرع طرح کیا جائے سب اِس پر طبع آزمائی کریں اگر یہ بھی مصرع لگائے تو شریک صحبت کر لیا جائے ورنہ شرمندہ ہوکر اُٹھ جائے گا۔ عنصری نے ابتدا کی اور کہا ع چوں عارضِ تو ماہ نباشد روشن فرخی نے کہا ع مانند رخت گل نبود در گلشن

عسجدی نے کہا ع مژگانت ہی گزرکند از جوشن
قافیوں میں شین کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ قافیہ باقی نہیں رہا تھا
فردوسی نے برجستہ کہا ع مانند سنانِ گیو در جنگ پشن
سب نے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی فردوسی نے تفصیل بیان کی اِس وقت تو سب نے اِس کو
شریکِ صحبت کرلیا لیکن رشک اور حسد ایشیائی قوموں کا خاصہ ہی سب نے سازش کی کہ
فردوسی دربار تک نہ پہونچنے پائے۔" (شعر العجم صفحہ ۹۶ و ۹۷)

اِس قصہ کا اصلی راوی صاحب دیباچۂ قدیم ہی لیکن اِس کے ہاں وہ حصہ جو حسد اور سازش سے تعلق رکھتا ہی غیر حاضر ہے۔ پشن کسی پہلوان کا نام نہیں جیسا کہ برون اور شبلی کا خیال ہی وہ ایک مقام کا نام ہی جہاں ایرانی لشکر پر تورانیوں نے شبخون مارا تھا۔ شاہنامہ میں اس کے متعلق حسب ذیل روایت ہی۔

ایرانی لشکر بسر کردگی طوس بن نوذر کاسہ رد کے قریب پہونچ جاتا ہی پہاڑی گھاٹی میں جہاں سے رستہ جاتا ہی تورانیوں نے ناگہانی حملوں سے تحفظ کی خاطر ہیزم کا انبار لگا دیا ہے ایرانی لشکر اس انبار میں آگ لگا کر بخیریت غنیم کے علاقہ میں گھس جاتا ہی سامنے ایک حاکم نشین قلعہ ہی جس کے حاکم کا نام نژاو ہی۔ نژاو دوسرے روز بیژن سے جنگ کرکے فرار ہو جاتا ہی۔ اس کی بیوی اسپنوی گرفتار کرلی جاتی ہی ایرانیوں کی آمد کی اطلاع افراسیاب کو ملتی ہی اور تورانی لشکر بسپہ سالاری پیران ویسہ بہت جلد طیار ہو کر مقابلہ کے لئے روانہ ہوتا ہی۔ جاسوسوں کے ذریعہ سے پیران کو اطلاع ملتی ہی کہ ایرانی شرابیں پی پی کر مست و غافل پڑے ہیں طلایہ اور چوکی کا کوئی انتظام نہیں ہی۔ رات کو پیران معہ اپنی تمام فوج کے بقصد شبخون آتا ہی ایرانیوں کو سوتا دیکھکر حملہ کر دیتا ہی اور قتل عام ایک بڑے وسیع پیمانہ پر شروع ہو جاتا ہی۔ گیو اپنے خیمہ میں بیدار رہی ہتیار لگا اور گھوڑے پر سوار ہو کر سپہدار یعنی طوس کے خیمہ میں آکر اس کو بیدار کرتا ہی پھر اپنے باپ گودرز کو جاکر جگاتا ہی ادھر بیژن کو جو مست پڑا تھا ہوشیار کرتا ہی۔ اتنے عرصہ میں تورانیوں نے کشتوں کے پشتے لگا دئے تھے۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ تمام ایرانی فوج کٹ چکی تھی اور یہی معدودے چند متنفس بچے تھے۔ الغرض یہی مناسب معلوم ہوا کہ فرار اختیار کیا جائے خیمہ خرگاہ بار و بنہ چھوڑ کر بھاگے۔ تورانیوں نے تعاقب کیا

اور فراریوں نے ایک پہاڑ پر چڑھکر جانیں بچائیں۔ یہ حالات ہیں اس بہت مشہور جنگ پشن کے۔ میرا مقصد اِس جملہ معترضہ سے یہی ہے کہ ہم نے جنگ پشن کے حالات دیکھ لئے ہیں اِس میں کوئی ایسا موقعہ نظر نہیں آتا جس میں سنان گیو کی کوئی قابل ستایش و تحسین کارگزاری دیکھی جاتی جس کے بنا پر مصرع بالا میں کوئی خوش گوار تلمیح قایم ہوتی یہ چند نفوس جن میں گیو بھی شامل ہے بدشواری تمام اپنی جانیں بچاکر بھاگے ہیں نہ گیو کو اس جنگ میں کسی فخریہ کارنامہ کا موقعہ ملا ہے اور نہ اس نے کبھی اس پر فخر کیا ہے۔ اس کے برخلاف ہومان تورانی جب کہ گیو اور طوس سے میدان جنگ میں ایک موقعہ پر مناظرہ میں مصروف ہے فخریہ کہتا ہے

تو دانی کہ من روز جنگِ پشن　　چہ کشتم بداں رزمگاہِ کشن

(شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۲۷۲ طبع ۱۲۷۵ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ جنگ پشن ایرانیوں کے لئے ایک شرمناک ہزیمت تھی اور مصرع بالا میں گیو کے نیزہ کے لئے جو ادعا کیا گیا ہے بالکل بے حقیقت ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مصرع کسی ایسے شخص کے قلم سے نکلا ہے جو بوجہ شہرت محض اس جنگ کے نام سے واقف ہے لیکن اس کی اصلی کیفیت اور ضمنی واقعات سے بالکل بے خبر ہے پشن کے متعلق شاہنامہ میں کئی تلمیحیں موجود ہیں۔ یہ ادعا بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ شین کے التزام کے ساتھ کوئی اور شگفتہ قافیہ موجود نہیں کَشَن (بفتح اوّل وثانی بمعنی انبوہ بسیار) پشن سے زیادہ مشہور اور شگفتہ قافیہ موجود ہے اور غزنوی دَور میں ہر شاعر نے اس کا استعمال کیا ہے۔ فردوسی ؎

یکے سرو بد سبز و برگش کشن　　بروشاخ چوں رزمگاہِ پشن

اوزان رُباعی میں اِس قدر گنجایش ہے کہ اسباب اور اوتاد ہمقافیہ ہوسکتے ہیں اسی وجہ سے جوشن (جس میں دو سبب خفیف ہیں) اور پشن (جو وتد مجموع ہے) قافیہ بن گئے۔ اگر اس قصہ کے ہیرو واقعی عنصری و فرخی ہیں تو ان کے لئے نہایت آسان تھا کہ اپنی قوافی کو بحر متقارب سالم یا بحر ہزج سالم اور متعدد اور مشہور بحروں میں لاکر جن کے قافیے صرف اسباب پر ختم ہوتے اور اوتاد کا استعمال ناممکن ہوجاتا فردوسی اور اس کے بے محل مداخلت سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھتے۔

ایسے بڑے پایہ کے شعرا سے اس ادنیٰ سے نکتہ کی فروگزاشت ناقابل معافی ہے۔

فردوسی غزنین میں سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت پہونچتا ہی کیا ایسے ابتدائی زمانہ میں یہ مشہور شعرا عنصری فرخی اور عسجدی جو ہر ایک فن کا کامل اُستاد ہی شہرت حاصل کر کے محمود کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اوروں کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن فرخی کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہی کہ وہ سلطان محمود کے دربار میں اس عہد سے پندرہ سولہ سال بعد آیا ہی جیسا کہ فرخی کے حالات میں گزارش ہو چکا ہی۔ ان وجوہ کی بنا پر مجھکو اس قصہ کے تسلیم کرنے سے انکار ہی مغربی تنقید بھی اس کے تسلیم کرنے سے منکر ہی۔

اِس کے بعد شبلی سلطان محمود کے ندیم ماہک کا قصہ قلبند کرتے ہیں جس میں دکھایا گیا ہی کہ ماہک کے معرفت فردوسی دربار سلطانی میں رسائی حاصل کرتا ہی لیکن اس قصہ کا راوی بھی صاف دیباچہ بایسنغری ہی اور اسے فہرست میں داخل ہونا چاہیے جس میں رودکی اور عنصری والا قصہ درج ہوا ہی۔

اِس کے بعد شبلی فرماتے ہیں:-

"یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان محمود نے شاہنامہ کی تصنیف کا حکم دیا تھا اور سات شاعر یعنی عنصری، فرخی، زینی، عسجدی، منجیک چنگزن، خرمی، ابو بکر اسکاف ترمذی اس کام کے لئے انتخاب ہوئے تھے۔" (شعر العجم صفحہ ۹۹ و ۹۸)

شاہنامہ کے لئے سات شعرا کا سلطان کے حکم سے مامور ہونے کا قصہ سب سے پہلے دیباچہ بایسنغری میں ملتا ہی اس کی مجہولیت کے لئے یہی کافی دلیل ہی۔ شعرا کے نام لکھنے میں شبلی خاص بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ اِن ناموں میں نمبر سوم زینی ہے اس نام کا کوئی شاعر نہیں گزرا۔ ان کی مراد غالباً زینتی سے تھی۔ محمد عوفی اُس کو زینتی علوی محمودی لکھتا ہی۔ نمبر پنجم منجیک اس کا پورا نام ابو الحسن علی الترمذی ہی عوفی اس کو شعرائے آلِ سامان میں داخل کرتا ہے اور ابو المظفر طاہر بن الفضل کا مادح بیان کرتا ہے۔ طاہر ۳۸۱ھ میں وفات پاتا ہی۔ نمبر ششم خرمی اس شاعر کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا عوفی اور نظامی اس سے ناواقف ہیں۔ نمبر ہفتم ابو بکر اسکاف، ترمذی۔ تذکروں میں کسی ابو بکر اسکاف کا سراغ نہیں چلتا نفحات الانس میں البتہ جامی ایک بزرگ ابو بکر اسکاف کا ذکر کرتے ہیں۔ دیباچہ بایسنغری میں ابو بکر اسکاف کے بجائے ابو حنیفہ اسکاف ملتا ہی۔ عوفی نے شعرائے آلِ سلجوق میں اس کا شمار کیا ہی اور اس کا زمانہ عہد سلطان سنجر

قایم کیا ہی لیکن عوفی کو اِس بارہ میں سہو ہو گیا ہے ابوحنیفہ اسکاف جو سلطان ابراہیم غزنوی کا مدّاح ہے ابوالفضل بیہقی اپنی تاریخ میں اس کی بہت تعریف کرتا ہی وہ فضل وادب اور علمیت میں بےمثال تھا شعر اس کے کمترین صنعت ہی۔ جب ابوالفضل سے اس کی پہلے ملاقات امیر فرّخ زاد سنہ ۴۴۳ھ و سنہ ۴۵۱ھ کے عہد میں ہوئی ہی ابوحنیفہ اِس وقت مفت درس دیا کرتا تھا۔ ابوالفضل کی فرمایش سے اس نے تین قصیدے لکھّے ہیں جو تاریخ بیہقی صفحہ ۳۳۵ — صفحہ ۳۴۴ اور صفحہ ۴۷۰ — صفحہ ۴۷۶ اور صفحہ ۶۹۷ — صفحہ ۸۰۱ پر درج ہیں سلطان ابراہیم نے اپنے حبس کے ایّام میں ابوحنیفہ کی بعض تصنیفات دیکھیں ان کی عبارت اور خط کو بہت پسند کیا جب تخت نشین ہوا ابوحنیفہ کو بلوایا اور اس کے قصیدے سُنے اور خوب خوب انعام دیئے اور تربیت کی۔ بعد میں منصب اِشراف ترمذ اس کے سپُرد ہوا۔

قولہ " فردوسی اِس وقت چپکا ہو رہا اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی رات کو جب معمول کے موافق کھانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا عنصری سے پہلے شعرا نے رستم و سُہراب کی داستان نظم کی ہی چنانچہ خود میرے پاس ایک نظم موجود ہی جس کے آگے عنصری کے اشعار کی کچھ حقیقت نہیں یہ کہکر نظم حوالہ کی۔ سرنامہ تھا ؎

کنوں خورد باید مے خوشگوار — کہ می بوئے مشک آرد از جویبار
ہوا پر خروش و زمیں پر ز جوش — خنک آنکہ دل شاد دارد بنوش
ہمہ بوستاں زیر برگ گل است — ہمہ کوہ پر لالہ و سنبل است

دیباچہ میں نہ کھانا کھانے کا ذکر ہی اور نہ عنصری سے پہلے داستان رستم و سہراب کی نظم کا اس کی عبارت ہی:۔

ابُوالقاسم باندک زبان داستان رستم و اسفندیار نظم کرد چنانکہ ماہک واقف بنود ابتدائش آں بود ؎

کنوں خورد باید مے خوشگوار — کہ می بوئے مشک آرد از جویبار

شبے باماہک گفت سیر الملوک را بیشتر نظم دادہ اند و صنعت سخنوری آنرا اساس محکم نہادہ

ما ہک گفت ممکن نباشد"

لطف یہ ہے کہ مولانا رستم و سہراب کی داستان کا ذکر کرتے ہیں اور شعر داستان رستم واسفندیار کے نقل کر رہے ہیں۔ بہرحال دیباچہ کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو فردوسی نے سلطان محمود کو پیش کی داستان رستم واسفندیار ہے نہ داستان رستم و سہراب۔ دیباچۂ قدیم اس سلسلہ میں داستان سیاوش کا ذکر کرتا ہے لیکن شاہنامہ کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو سلطان محمود کو پیش کی گئی ہے داستان جنگ کیخسرو ہے۔ شاہنامہ میں سب سے پہلا موقعہ یہی ہے جہاں سلطان محمود کے مدحیہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ ان کی ابتدا ہے ؎

زیزدان ابر شاہ باد آفریں | کہ نازد بدو تخت و تاج و نگیں
خداوند تاج و خداوند گنج | خداوند شمشیر و خفتان و رنج
کہ گنجش ز بخشش بنالد ہمی | بزرگی ز نامش بیالد ہمی
ز دریا بدریا سپاہ ویست | جہاں زیر فر کلاہ ویست
بگیتی بکاں اندروں زر نماند | کہ منشور بخشش ورا بر نخواند
ز دشمن ستاند رساند بدوست | خداوند پیروز گر یار اوست
بزرم اندروں گنج پیرا گند | چو رزم آیدش شیر و پیل افگند
چو او مرز گیرد بہ شمشیر تیز | برانگیزد اندر جہاں رستخیز
از آں دست و آں تیغ گوہر فشاں | ز گیتی بجوید ہمی جز نشاں
کہ در بزم دریاش خواند سپہر | برزم اندروں شیر خورشید چہر
گواہی دہد در جہاں آب و خاک | ہماں بر فلک چشمۂ آفتاب
کہ چوں او نبو دست شاہی بجنگ | نہ در بخشش و کوشش و نام و ننگ
اگر مہر با کیں بیامیز دے | ستارہ ز خشمش فرو ریز دے
تنش زور مند است و چندیں سپاہ | کہ اندر میاں باد را نیست راہ
پس لشکرش ہفتصد ژندہ پیل | خدائے جہاں یار و رہ جبرئیل

ہمی باژ خواہد زہر مہترے — زہر نامدارے و ہر کشورے
اگر باژ ندہند کشور دہند — ہماں گنج و ہم تخت و افسر دہند
کہ یارد گزشتن ز پیمان اوے — وگر سرکشیدن ز فرماں اوے
کہ در بزم گیتی بدورشن است — برزم اندروں شیر درجوشن است
ابوالقاسم آں شہریار دلیر — کجا گور بستاند از چنگ شیر
جہاندار محمود کاندر نبرد — سرِ سرکشاں اندر آرد بگرد

(شاہنامہ جلد دوم ص ۲۴۴ بمبئی ۱۲۷۵ھ)

اِس مدح کے بعد فردوسی گویا ہی کہ میں نے یہ نظم اِس مقصد سے لکھی ہی تاکہ ایّام پیری میں اُس سے نفع حاصل کروں لیکن مجھکو کوئی قدردان سرپرست نہیں ملا۔ میں منتظر رہا حتیٰ کہ اس اُمید اور انتظار میں عمر کے پینسٹھ سال میں نے فکرِ افلاس اور پریشانی میں گزار دیئے جب پینسٹھ گزر کر میں چھیاسٹھویں سال میں لگا ضعیفی نے عصا میرے ہاتھ میں دیدیا میری سُرخ و سفید رنگت زعفرانی ہوگئی بڑھاپے نے کمر جھکا دی آنکھوں کی بصارت ضعیف ہوگئی تب میں نے ایک آواز سُنی کہ فریدوں کی تلاش کون کررہا تھا وہ دیکھو فریدوں زندہ ہوگیا اور زمین و زمانہ اِس کے غلام بن گئے (یہ تلمیح ہی سلطان محمود کی تخت نشینی کی طرف) اِس نے اپنی فیاضی اور انصاف سے دنیا کو مسخر کرلیا ہی اس کی تاریخ کے آثار اور علامات سب طرف نمایاں ہیں جب میں نے یہ آواز سُنی اپنی کتاب اِس کے نام پر منسوب کردی اور توقع کرتا ہوں کہ پادشاہ اِس ضعیفی کے عالم میں میری دستگیری کرے اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ میں اُس وقت تک تندرست رہوں کہ یہ کتاب پادشاہ کے نام پر ختم کردوں اسی تمہید میں ذیل کے شعر آتی ہیں

چو پیکار کیخسرو آمد پدید — زمن جادوی ہا بباید شنید
بدیں داستاں در بیارم ہمی — بنگ اندروں لالہ کارم ہمی
کنوں خطبۂ یافتم زیں نشاں — کہ مغزِ سخن یافتم بیش ازاں

اِن اشعار سے ظاہر ہی کہ شاہنامہ فردوسی اس وقت سلطان کے نام معنون کرچکا ہی تب ہی تو فخریہ

لہجہ میں کہتا ہی کہ جنگ کیخسرو کے دوران میں تم میری سحر کاریاں دیکھنا اس داستان میں موتیوں کا مینہ برسا دوں گا اور پتھر میں لالہ اُگا کر ناممکن کو ممکن کر دکھاؤں گا میرے دیباچہ کے لئے ایسا عالیشان مخاطب مل گیا ہی جس سے میرے سخن گستری کے مغز میں بیشی ہو گئی ہی۔

شاہنامہ سے اِس قدر اور معلوم ہوتا ہے کہ داستان رستم وسہراب اور داستان سیاوش طوس میں لکھی گئی تھیں۔ مؤخر الذکر داستان فردوسی نے اپنی عمر کے سال پنجاہ وہشتم یا ۳۸۸ھ میں لکھی ہی۔ داستان رستم و اسفندیار اگرچہ غزنین میں لکھی گئی ہے اور اس میں سلطان کی طرف تلمیح بھی موجود ہی تاہم اس کو اولیت کا فخر حاصل نہیں اس کے مقابلہ میں داستان سکندر بہتر استحقاق رکھتی ہی۔

قولہ فردوسی نے کہا طوس کا باشندہ ہوں محمود نے اس کے حالات پوچھے اور اسی سلسلہ میں پوچھا کہ طوس کب سے آباد ہی اور کس نے آباد کیا فردوسی نے تفصیل سے تمام واقعات بیان کئے۔ (صفحہ ۵۰)

یہ باتیں سلطان اور فردوسی میں گویا داستان اسفندیار سُنانے کے بعد ہو رہی ہیں۔ مولانا طوس کی آبادی کے بیانات کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے گزر گئے ہیں ان کی تفصیل دیباچہ بایسنغری میں حسب ذیل ہی کہ :-

> جب کیخسرو نے اپنے باپ سیاوش کا انتقام لینے کے لئے طوس بن نوذر کو افراسیاب سے جنگ کے لئے بھیجا تو ہدایت کر دی کہ کلات کے راستہ سے توران نجانا کیوں کہ وہاں میرا ایک بھائی فرود رہتا ہی وہ سودائی مزاج ہے ایسا نہو کہ تجھ سے لڑ مرے۔ طوس اس ہدایت پر تعمیل کا اقرار کر کے رخصت ہوا۔ جب تورانی سرحد آئی کیخسرو کی ممانعت کے باوجود اس نے کلات ہی کا راستہ اختیار کیا۔ بعد میں کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ طوس اور فرود میں جنگ ہوئی اور فرود مارا گیا۔ کیخسرو فرود کے قتل کی کیفیت معلوم کر کے بہت برافروختہ ہوا کہ میں نے طوس کو باپ کے خون کا بدلہ لینے بھیجا تھا نہ بھائی کو قتل کرنے۔ جب طوس توران سے لوٹا اس ندامت کی وجہ سے کیخسرو کے پاس نہیں گیا بلکہ خراسان میں ٹھہر گیا اور وہاں کسی قصبہ کو شہر کی صورت میں آباد کر کے اپنے نام پر اس کا نام شہر طوس رکھا۔"

اُس قصہ کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود سے بیان کیا جس سے تاریخ میں فردوسی کی بلند پائگی کا نقش سلطان کے دل پر جم گیا۔ میں اس روایت کے پچھلے حصہ سے یہاں بحث کرتا ہوں۔ اتفاق سے شاہنامہ میں یہ تمام قصہ موجود ہے شاہنامہ میں لکھا ہے کہ جب کیخسرو کو اپنے بھائی فرود کے مارے جانے کا پرچہ گذرا تو اس نے اپنے چچا فریبرز کو سپہ سالار بنا کر بھیجدیا اور طوس کو معزول کر کے واپس آنے کا حکم دیا طوس لشکر کی کمان فریبرز کے سپرد کر کے سیدھا کیخسرو کی خدمت میں پہونچ گیا چنانچہ شاہنامہ ؎

برفت و ببرد آنکہ بد نوذری	سواران جنگ آور لشکری
برہ بر نکرد ایچ گونہ درنگ	بنزدیک شاہ آمد از دشت جنگ
زمیں را ببوسید در پیش شاہ	نکرد ایچ خسرو بدو در نگاہ
بدشنام بکشاد لب شہریار	برآں انجمن طوس را کرد خوار

خسرو نے بڑی لعنت و سرزنش کے بعد طوس بن نوذر کو اس کو اُسی کے گھر میں قید کئے جانے حکم دیا جس کو خدائے سخن اپنے برجستہ اور زوردار الفاظ میں یوں ادا کرتا ہے ؎

نژاد منوچہر و ریش سفید	ترا داد بر زندگانی اُمید
وگرنہ بفرمودمی تا سرت	بداندیش کردی جدا از برت
برو جاوداں خانہ زندان تست	ہماں گوہر بد نگہبان تست
ز پیشش براند و بفرمود بند	بہ بند از دلش بیخ شادی بکند

(شاہنامہ صفحہ ۳۱۷ جلد دوم طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

اب ظاہر ہے کہ شاہنامہ کے بیان کے مطابق طوس بجائے خراسان میں ٹھہرنے اور طوس آباد کرنے کے سیدھا کیخسرو کے پاس جاتا ہے اور قید کردیا جاتا ہے۔ شاہنامہ سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ شہر طوس، طوس بن نوذر کے وقت سے بہت پہلے سے آباد ہے، گنج عروس کیکاؤس نے طوس ہی میں رکھا تھا۔ کیخسرو نے یہ خزانہ خلع سلطنت کے وقت گیو زال اور رستم پر تقسیم کردیا (شاہنامہ) ؎

دگر گنج کش خواندندے عروس	کہ آگند کاؤس در شہر طوس

بگودرز فرمود کانرا بہ بخش   بگیو و بزال و خداوند رخش

سام نے جو رستم پہلوان کا دادا ہی اسی طوس میں ایک اژدہا مارا تھا۔ داستان رستم و اسفندیار میں رستم اپنے اسلاف کی ستایش کے وقت سام کے ذکر میں گویا ہی ؎

نخستیں بطوس اندروں اژدہا   کہ از چنگ اوکس نگشتے رہا
بدریا نہنگ و بخشکی پلنگ   دمش نرم کردے بگہ خارہ سنگ
بکشت آنچناں اژدہارا بگرز   جہاں گفت او را زہی فرو برز

شہر طوس کی بنانے کے لئے ہمارے ہاں عام طور پر طوس بن نوذر کا نام لیا جاتا ہی اور یہ روایت دیباچہ بایسنغری سے قدیم ہی پہلوی روایات بھی اسے عقیدہ کی موید ہیں جیسا کہ "شتروی ہائے ایران" (شہرہائے ایران) سے معلوم ہوتا ہی میرا مطلب یہاں اس روایت کے صحت وسقم سے نہیں ہی بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اِس قصہ کا فردوسی کی طرف منسوب کیا جانا غلط ہی۔

شبلی فرماتے ہیں:-

اِس زمانہ میں امرد پرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا محمود نے فردوسی سے فرمایش کی کہ ایاز کے سبزۂ خط کی تعریف میں کچھ کہے فردوسی نے برجستہ کہا ؎

مست است بتا چشم تو و تیر بدست   بس کس کہ ز تیر چشم مست تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ عذر ش ہست   کز تیر بتر سد ہمہ کس خاصہ ز مست   (شعر العجم صفحہ ۹۹)

عنصری اور فرخی کے ذکر میں اس خاص موضوع پر مولانا کافی لکھ چکے تھے اگر اِس موقعہ پر ایاز کے قصہ کو نہ دوہراتے تو کرم کرتے - ع

کہ حلوا چو یکبار خوردند و بس

بار بار اِسی قسم کا لطیفہ پیش کرنا مولانا کے نزدیک قند مکرر ہو لیکن شعر العجم کے ناظرین شاید پسند نہ کریں خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ امرد پرستی قاطبتہً معیوب و مردود ہی۔ تذکروں میں تمام قسم کے مزخرفات بھرے پڑے ہیں ہر وقت نقل کفر کیوں کیجائے۔ علامہ شبلی نے شعر العجم کے ورق کے ورق فردوسی کے حالات سے بھر دیئے لیکن

افسوس ہے کہ ان کو ایک ادنیٰ سی بات اب تک معلوم نہیں ہوئی کہ آخر فردوسی سلطان محمود کے دربار میں کون سے زمانہ میں آیا ہے اگر اس خفیف سے واقعہ کی تعیین کر لی جاتی تو کئی موقعوں پر دیباچہ کی لغویات پر ایمان لانے سے بچ جاتے اور ایسا آسان شکار نہ بن جاتے۔ میں پھر گزارش کرتا ہوں کہ فردوسی سلطان محمود کے دربار میں اس کے اورنگ نشین ہوتے ہی آجاتا ہے یعنی ۳۸۴ھ میں غزنین آچکا ہے اس سال سے ۳۹۴ھ تک سلطان محمود سے اس کے خوشگوار تعلقات قایم رہتے ہیں اس کے بعد کوئی واسطہ نہیں رہتا اب میں یہ سوال پیش کرتا ہوں کہ ان ایّام میں کیا ایاز کے ارغواں زار پر سبزۂ خط نکل آیا تھا؟ اگر ایسا ہے تو کم سے کم ۳۸۹ھ میں اس کی عمر اُنیس سال کی ہونی چاہیئے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مولانا فرخی کو بھی ایاز کے تیر نگاہ کا زخمی بتا چکے ہیں جس کی پاداش میں شاعر کا دربار بند ہوتا ہے (شعر العجم صفحہ ۷۸)

یہ پہلے دکھایا جا چکا ہے کہ فرخی غزنی میں ۴۰۵ھ کے بعد آیا ہے ایاز جس کا شعلۂ عارض ۳۸۹ھ میں آتش خس پوش بن چکا ہے فرخی کی آمد پر چھتیس سال ہونا چاہیئے۔ اب ایک مہ چاردہ سالہ کے بجائے مولانا شبلی فرخی کے آغوش میں بت سی و شش سالہ دھکیل رہے ہیں خواہ کوئی کیسا ہی بد مذاق نظر باز کیوں نہ ہو میرے خیال میں سی و شش سالہ معشوق کے پہلو نشین ہونے میں اس کو بہت کچھ عذر و تامل اعتراض اور انکار ہوگا اس عمر میں ایاز کی حسن و معشوقی کی اداؤں میں سے صرف ایک چیز زیادہ اہمیت رکھتی ہوگی اور وہ اُس کی پاؤں کی محاسن ہوگی جس نے اس کے آفتابی چہرہ کو تمام طرف سے محصور کر لیا ہوگا۔

ناظرین کو فرخی کا قصیدہ ایاز کی تعریف میں یاد ہوگا جس کے بعض اشعار فرخی کے حالات میں نقل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک دو شعر یہاں دوبارہ نقل کرتا ہوں ؎ (فرخی)

سوار یکرہ در میداں بباید | بایں اندر قد و لہائے نظار
یکے گوید کہ آں سرو یست برکوہ | یکے گوید گلِ تازہ است پر بار
زنانِ پارسا از شوے گردند | بکا بیں کردنی او را خریدار

یہ قصیدہ غالباً ۴۲۲ھ کے بعد لکھا گیا ہے فرخی یہاں ایاز کو کبھی سرو کہتا ہے اور کبھی گلِ تازہ۔ اس قسم کے الفاظ سولہ سترہ سے پچیس۲۵ تیس سالہ نوجوان کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں نہ ترپن چوّن سال کے

بوڑھے ہو گئے ہوں گے اس لئے۔ اس سے ہیں یہ قیاس مرتب کرتا ہوں کہ ایاز ۴۲۲ھ میں اپنی عمر کا خوشترین دور یعنی شباب کا زمانہ طے کر رہا تھا اور یہ کہ جب فردوسی سلطان کے یہاں آیا ہے یعنی ۳۸۹ھ میں اس کا وجود بھی دنیا میں نہ تھا اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ایاز ان ایام میں پیدا ہو چکا تھا تو اپنی ماں کی گود میں کھیلتا ہوگا۔ اب ایک گود میں کھیلتے بچہ کے لئے سلطان کی فرمایش اور فردوسی کے ارشاد کی تعمیل ایک مضحکہ خیز شکل پیدا کر دیتی ہے بات صرف اتنی ہے کہ رباعی بالا ایک نامعلوم طریقہ سے فردوسی کی طرف منسوب ہے غالباً دیباچہ بایسنغری اس کا قدیم ترین راوی ہے۔

فرماتے ہیں :۔

> "دولت شاہ نے لکھا ہے کہ چوں کہ فردوسی نے ایاز کی طرف کبھی رخ نہیں کیا اس لئے اس نے در اندازی کی اور محمود کو یقین دلایا کہ فردوسی رافضی ہے" نظامی عروضی کا بیان ہے کہ دربار کا بڑا گروہ وزیر اعظم حسن میمندی کا مخالف تھا اور چوں کہ فردوسی کا مربی اور سرپرست وہی تھا اس لئے اس کی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا" دیباچہ میں ہے کہ فردوسی کو خود حسن میمندی نے تباہ کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنین اور اطراف وجوانب کے امرا فردوسی کو طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے فردوسی بھی اشعار کے ذریعہ سے ان کا شکریہ ادا کرتا تھا حسن کو یہ ناگوار معلوم ہوتا تھا لیکن فردوسی کچھ پروا نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا ؎
>
> من بندہ کز مبادیِ فطرت نبودہ ام ۔۔۔ مائل بمال ہرگز و طامع بجاہ نیز
>
> سوئے درِ وزیر چرا ملتفت شوم ۔۔۔ چوں فارغم ز بارگہ پادشاہ نیز
>
> حسن میمندی مذہباً خارجی تھا اور فردوسی شیعہ اس لئے اس نے فردوسی کی مخالفت کی ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے۔" (شعر العجم صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲)

جب پروفیسر براؤن نے دیباچہ بایسنغری کی طرف التفات نہیں کی تو اس کی یہی وجہ تھی کہ دیباچہ کے بیانات (اور مجھکو کہنا چاہیے اکثر بیانات) پایہ تاریخ سے ساقط ہیں لیکن شبلی نے اس قابل مورخ کی تصنیف کو تو "براؤن کی کھتونی" کہکر دور پھینک دیا اور دیباچہ پر آنکھ بند کرکے بھروسہ کر لیا۔ اب یاس کے لہجہ میں فرماتے

ہیں کہ اِن متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے۔ یہ وہی مثل ہوئی جیسے کوئی کہے کہ تاریخ میں ہارون الرشید کے بیانات الف لیلیٰ کے بیانات سے مختلف ہیں اب ان میں کس پر اعتبار کیا جائے۔ یہ معاملہ تو نہایت آسان تھا سب کو معلوم ہے کہ نظامی نے ۵۵۰ھ کے قرب وجوار میں اپنی کتاب لکھی ہے اور دیباچہ ۶۲۹ھ میں لکھا گیا اب جو ذرائع معلومات کے نظامی کو مل سکتے ہیں وہ صاحب دیباچہ یا دولت شاہ کو نہیں مل سکتے اِس لئے نظامی کے بیانات کے مقابلہ میں دیباچہ کی لغویات کو کوئی وقعت نہیں دیجا سکتی۔ دیباچہ نگار کا مایۂ تحقیق صرف اِس ایک ادنیٰ سی بات سے ظاہر ہے کہ اِس کو دیگر واقعات درکنار سلطان محمود کے وزیر کا نام تک صحیح معلوم نہیں۔ اِس وزیر کا نام خواجہ ابو القاسم احمدؒ بن حسن میمندی ہے والدین کے گناہ کی اولاد کو عقوبت ملتے سنا ہے۔ لیکن فرزند کی بداعمالیوں کے پاداش میں صاحب دیباچہ نے احمد کے باپ حسن کو ماخوذ کیا ہے۔ علامہ شبلی جو ایک مؤرخ بے بدل ہیں بجائے اِس کے کہ ان امور سے دیباچہ کے اقوال کی لغویت کا سُراغ چلاتے خود اس کے لغویت کے شکار بن گئے۔ چنانچہ بار بار اسی کا نام حسن میمندی لکھ رہے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جہاں نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں "خواجۂ بزرگوار احمد حسن" لکھا تھا شبلی نے اِس کو بھی اصلاح دیدی۔ چنانچہ جب اِس کا بیان نقل کیا تو وہاں احمد حسن کے بجائے حسن میمندی لکھا گویا نظامی کی غلطی کی تصحیح کی۔ مولانا کو معلوم ہوتا ہے گلستاں خوب یاد تھی کیوں کہ اِس میں ایک حکایت آتی ہے۔ "تنے چند از بندگان سلطان محمود گفتند حسن میمندی را کہ سلطان چہ گفت در فلاں مصلحت" (باب چہارم حکایت ہفتم) لیکن شیخ سعدی کو میں مصلح اخلاق مانتا ہوں نہ مصلح تاریخ۔ جو لوگ غزنوی ادبیات اور اس عہد کے تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ خواجہ احمد بن حسن میمندی اپنے ذاتی نام سے یاد کئے گئے ہیں نہ ان کے باپ حسن میمندی کے نام سے۔ فرخی کہتا ہے ؎

خواجہ بزرگ شمس کفاۃ احمدِ حسن   کاحسان او و نعمتِ او دست کبریاست

دیگر

دستور ملک صاحب ابوالقاسم احمد   آں حمد و ثنا را بدل و دیدہ خریدار

عتبی اور بیہقی وغیرہ سب اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ حسن میمندی کسی زمانہ میں سلطان کا وزیر نہیں بنا بلکہ امیر

ناصر الدین سبکتگین کے عہد میں کسی خطا پر مصلوب ہوا تھا۔ دوسری بات یہ ہی کہ جن دنوں فردوسی کا قصہ درپیش تھا ان دنوں خواجہ احمد میمندی وزیر نہیں تھا بقول عتبی ۳۸۴ھ میں خواجہ احمد باقاعدہ وزیر بنایا جاتا ہی اگرچہ اس سے چند سال پیشتر نیم سرکاری طریقہ پر وزارت کا کام بھی کرتا رہا ہی۔ اشعار کی زبان بھی فردوسی کی زبان نہیں ہی میں نظامی کے بیان کو تسلیم کرتا ہوں اس استثنا کے ساتھ کہ جب کہ فردوسی کا دوست اور محسن سلطان کا وزیر اوّل تھا وہ وزیر دوم کو سمجھا اس وزیر کا نام خواجہ ابو العباس فضل بن احمد اسفراینی ہی اس وزیر سے فردوسی کے اچھے تعلقات تھے شاہنامہ میں دو موقعوں پر اس کا ذکر آتا ہی اور فردوسی اس کا ممنون بھی معلوم ہوتا ہی۔ شاہنامہ ؎

زدستور فرزانۂ دادگر   پراگندہ رنج من آمد بسر[1]

صورتِ حالات میں یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کا سرپرست خواجہ ابو العباس تھا نہ خواجہ ابوالقاسم احمد شاہنامہ میں خواجہ ابوالقاسم کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

حسن میمندی مذہباً خارجی تھا۔ کاش اس موقعہ پر تو مولانا اپنی آنکھیں کھولتے کہ وہ شیعہ روایات کی بھول بھلیاں میں پھنس گئے ہیں۔ شبلی جیسے بلند پایہ مؤرخ کو کچھ تو اپنی درایت سے کام لینا چاہیئے تھا۔ یہ سوچنے کی بات ہی کہ خواجہ ابوالقاسم احمد جو سلطان محمود کا رضاعی بھائی بچپن کا دوست ہم مکتب اور ہم صحبت تھا خارجی کیوں کر ہو سکتا ہی۔ لیکن مولانا شیعہ روایتوں کے راز کو نہ سمجھے خواجہ کا خارجی خیال کیا جانا ایسا ہی ہے جیسا سلطان محمود کو خارجی کہنا۔ ہجو کے اشعار میں خود سلطان کو خارجی بنانے کی کوشش کی گئی ہی ہائے افسوس شبلی بردن کے سبعہ معلقہ کی سوئی نہ دیکھ سکے لیکن دیباچہ کے اونٹ کے اونٹ نگل گئے۔

قولہ دیباچہ میں ایک اور وجہ بیان کی ہے اور وہ قرین قیاس ہی سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت عداوت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ متعصب شیعہ تھے (دیباچہ میں رافضی کا لفظ تھا جس کو ہم نے بدل دیا) اس خاندان کا تاجدار فخر الدولہ تھا وہ فردوسی کا نہایت قدردان تھا جب فردوسی نے رستم و اسفندیار کی داستان نظم کی تو اس نے صلہ کے طور پر ہزار اشرفیاں

---

[1] جلد دوم ص ۲۴۴ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ

بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہایت اعزاز و احترام کیا جائے گا۔ یہ خبر تمام غزنین میں پھیل گئی محمود نے سُنا تو اِس کو ناگوار گزرا۔ (شعر العجم ص ۱۰۳)

یہاں علامہ شبلی پھر دیباچہ بایسنغری کے دام فریب میں پھنس گئے وہ اس کے عشوہ ہائے لاجوردی کے کچھ ایسے مفتون ہوگئے ہیں کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

فخر الدولہ دیلمی اور فردوسی کا قصہ تاریخی لحاظ سے قطعی غلط ہی جس کی تفصیل یہ ہی کہ رکن الدولہ بویہ المتوفی ۳۶۶ھ کے تین فرزند تھے عضد الدولہ موید الدولہ اور فخر الدولہ۔ عضد الدولہ بوجہ شہرت چنداں محتاج بیان نہیں موید الدولہ کو باپ نے حین حیات میں اصفہان دیدیا اور فخر الدولہ کو ری۔ رکن الدولہ کے بعد موید الدولہ نے عضد الدولہ اپنے بڑے بھائی کے حکم سے فخر الدولہ پر فوج کشی کی فخر الدولہ بھاگ کر قابوس بن وشمگیر کے ہاں پناہ گزین ہوا ۳۷۱ھ میں موید الدولہ نے جرجان پر حملہ کیا۔ قابوس اور فخر الدولہ شکست کھا کر خراسان بھاگ آئی سامانیوں نے ان کی امداد کے لئے حسام الدولہ ابو العباس تاش کے زبردست فوج روانہ کی لیکن مہم ناکامیاب رہی ۳۷۳ھ میں موید الدولہ کے انتقال پر فخر الدولہ اپنے بھائی کے تخت پر بیٹھا۔ امیر سبکتگین اور فخر الدولہ ماہ شعبان ۳۸۷ھ میں آگے پیچھے انتقال کرتے ہیں سبکتگین کے بعد باپ کی وصیت کے موافق امیر اسمٰعیل تخت نشین ہوتا ہی۔ ملک کے مقاسمہ پر بھائیوں میں جھگڑا ہوتا ہی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محمود ۳۸۹ھ میں اورنگ ہوتا ہی فردوسی اس تخت نشینی کے بعد غزنین میں آتا ہے داستان رستم واسفندیار غزنین ہی میں لکھی جاتی ہی اس کے خاتمہ میں سلطان کے حق میں دعائیہ اشعار موجود ہیں۔ چنانچہ شاہنامہ ؎

سرآمد کنوں رزم اسفندیار	کہ جاوید باد اسر شہریار
ہمیشہ دل از رنج پرداختہ	زمانہ بفرمان او ساختہ
دلش بادشادان و تاجش بلند	بگردن بداندیش او را کمند

قصہ کوتاہ جب داستان رستم واسفندیار لکھی گئی ہی فخر الدولہ اپنی قبر میں سو رہا تھا اِس لئے فخر الدولہ کا فردوسی کے لئے انعام بھیجنے کا قصہ بالکل لغو اور بے بنیاد ہی۔

قولہ بہر حال وجہ کچھ ہو واقعہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کی قدردانی کا حق ادا نہ کیا۔ فردوسی حمام میں

نہار ہا تھا کہ شاہنامہ کا صلہ پہونچا فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں
فردوسی نے بڑی بیتابی سے دست شوق بڑھایا لیکن سونے کے پھل کے بجائے چاندی
کے پھول تھے۔ فردوسی کے دل سے بیساختہ آہ نکلی تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں اور ایاز سے
کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خون جگر ان سفید دانوں کے لئے نہیں کھایا تھا۔ ایاز نے
محمود سے ساری کیفیت بیان کی محمود نے حسن میمندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی اور کہا تیری دراندازی
نے مجھکو بدنام کر دیا۔ میمندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیجدیتے تب بھی فردوسی کو
آنکھوں سے لگانا تھا انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے۔ اس چبھتے ہوئے فقرہ نے
محمود کے دل میں بھی اثر کیا"۔ (شعر العجم صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۵)

دیباچہ قدیم کسی راوی منصور کی سند پر لکھتا ہے کہ سلطان محمود کے دبیر ابوسہل ہمدانی نے سلطان سے عرض کی کہ ساٹھ ہزار دینار زر رکنی ایک شاعر کو دینے کی کیا ضرورت ہے طلائی سکّوں کے بجائے روپہلی سکّے ہی بہت ہیں۔ سلطان اس مشورہ پر عمل پیرا ہوا اور ساٹھ ہزار درم ایک ظرف میں رکھوا کر بھجوا دیئے۔ اس رقم کو فردوسی نے حمام کے دروازہ پر لٹوا دیا اس بارہ میں دیباچہ قدیم اور چہار مقالہ متفق ہیں۔

یہ رقم اگرچہ شاہنامہ کے مقابلہ میں ہیچ ہے تاہم ان ایام میں روپیئے کی قیمت پر لحاظ کرتے ہوئے اچھی خاصی رقم تھی۔ ساٹھ ہزار درم ہمارے سکوں میں پندرہ ہزار روپیئے کے مساوی ہے اب پندرہ ہزار روپیہ ایک اسّی سال کے بوڑھے کے لئے جو کہ افلاس کے ہاتھوں تنگ ہو چنداں محقّر نہیں۔ فردوسی کا شاہنامہ کی نظم سے یہی مقصد تھا کہ اس کا ضعیفی کا زمانہ آسائش اور فارغ البالی میں گزر جائے ؎

بہ پیوستم این نامۂ باستان — پسندیدہ از دفتر راستان
کہ تا روز پیری مرا بر دہد — بزرگی و دینار و افسر دہد[1]

یہ مقصد اس روپیہ سے ایک حد تک حاصل ہو سکتا تھا۔ میرے نزدیک اس رقم کثیر کا حمام کے دروازہ پر لٹوا دینا ناقابل عمل ہے اور نہ شاہنامہ اس قصہ کی تائید کرتا ہے۔ فردوسی کے بیان سے اس قدر معلوم

[1] شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۴۴۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ

ہوتا ہے کہ وہ حاسدوں اور بدگویوں کی سخن چینی کی وجہ سے سلطان کے ہاں سے قطعاً محروم گیا ؎

چنیں شہریارے و بخشندۂ ‏ ‏ ‏ بگیتی ز شاہاں درخشندۂ

نکرد اندریں داستانہا نگاہ ‏ ‏ ‏ ز بدگوئے و بختِ بد آمد گناہ

حسد برد بدگوئے در کارِ من ‏ ‏ ‏ تبہ شد بر شاہ بازارِ من

(شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۲۰۰ تمہید داستان شیریں خسرو)

بہرحال سائل منعم سے اور تشنہ دریا سے محروم گیا۔

محمود کے ہاں کئی بوسہل ہیں ایک بوسہل زوزنی دوسرا بوسہل حمدونی ایک بوسہل ہمدانی بھی ہے لیکن فردوسی کے عہد میں ان میں سے شاید ایک بھی دبیر نہ ہو حسن میمندی اس وقت اپنی گور میں آرام کر رہا تھا صاحبِ دیباچہ بایسنغری میں ایجاد کا مادہ ضرورت سے زیادہ ہے بعض اوقات اِس کے پاس قدیم راوی ہیں ورنہ اکثر اوقات وہ خود واقعات تراش لیتا ہے مثلاً ہجو سلطان محمود میں شعر ذیل اِس نے دیکھا ؎

مرا سہم دادی کہ در پائے پیل ‏ ‏ ‏ تنت را بسایم چو دریائے نیل

اس پر اس نے قصۂ ذیل طیار کیا جس کو میں شبلی کے الفاظ میں ادا کرتا ہوں۔

"محمود نے حسن میمندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی اور کہا تیری دراندازی نے مجھکو بدنام کر دیا میمندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیج دیتے تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگانا تھا انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے۔ اس چبھتے ہوئے فقرہ نے محمود کے دل میں اثر کیا اور برہم ہو کر کہا کہ کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزا چکھاؤں گا [یہاں دیباچہ کے اصلی الفاظ یہ ہیں کہ آں قرمطی را بامداد در پائے پیل اندازم و عقوبت او را عبرت سائرے ادباں سازم] فردوسی کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا صبح کو محمود باغ میں آیا تو فردوسی نے دوڑ کر پاؤں پر سر رکھدیا اور بدیہہ یہ اشعار پڑھے"؎

چو در مُلکِ سلطان کہ چرخش ستود ‏ ‏ ‏ بسے ہست ترسا و گبر و یہود

گرفتند در ظلِ عدلش قرار — شده ایمن از گردشِ روزگار

چه باشد که سلطان گردون شکوه — رہی را شمارد یکے زانگروه

سلطان محمود کو رحم آیا اور اُس کی تقصیر معاف کی۔" (شعر العجم ص ۱۰۵)

یہاں فردوسی کے بدیہہ اشعار کی زبان پر ہی ناظرین ایک منٹ کے لئے غور کریں۔

خدا جانے صاحبِ دیباچہ کا یہ کون سا پراسرار ذریعہ ہے جس سے حسب ضرورت وہ فردوسی کے اشعار نقل کر دیتا ہے جس تک نہ متقدمین کی رسائی ہوئی اور نہ متاخرین کی، اور اشعار بھی ایسے برمحل ہوتے ہیں کہ گویا فردوسی نے اسی موقعہ کے لئے لکھے تھے۔ یہی کیفیت ان اشعار کی ہے جو ناصر لک کے نام فردوسی نے لکھے ہیں اور شبلی نے جن کو صفحات ۱۰۷ و ۱۰۸ پر نقل کیا ہے۔ میں اس عقیدہ پر آگیا ہوں کہ وہ فردوسی کی ٹکسال کے نہیں اور صاحب دیباچہ فردوسی کے مقابلہ میں ان کا جائز مالک کہلائے جانے کا زیادہ مستحق ہے۔

قولہ "فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا ؎

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست — چگونہ دریا کانرا کنارہ پیدا نیست

چو غوطہا زدم واندرو ندیدم در — گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست" (شعر العجم صفحہ ۱۰۸)

یہ قطعہ دراصل چار شعر کا ہے اور فردوسی کا معلوم ہوتا ہے اگرچہ کوئی قدیم سند معلوم نہیں وہو ہذا۔

حکیم گفت کسی را کہ بخت والا نیست — بہیچ وجہ مرا و را زمانہ جویا نیست

برو مجاور دریا نشیں مگر روزے — بدست افتد درّے کجاش ہمتا نیست

خجستہ درگہِ محمود زابلی دریاست — کدام دریا کانرا کرانہ پیدا نیست

شدم بدریا غوطہ زدم ندیدم دُر — گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست

قولہ "سُلطان نماز جمعہ پڑھنے کے لئے جامع مسجد میں آیا تھا اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی نہایت متاسف ہوا مسجد سے آکر ناصر لک کا عریضہ دیکھا اور بھی مکدر ہوا جن لوگوں نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے اُن کو بلا کر سخت توبیخ کی کہ تم نے دنیا میں مجھکو بدنام کر دیا۔" (شعر العجم صفحہ ۱۰۸)

یہاں دیباچہ میں صاف لکھا ہے کہ سلطان نے حسن میمندی کو فردوسی کے حق میں کانٹے بونے کی پاداش میں ہلاک

کر دیا مولانا شبلی خدا جانے کیوں اس اہم واقعہ کو قلم انداز کر گئے دیباچہ کے الفاظ ہیں:-

"بدان جماعت کہ خیانت بفردوسی کردہ بودند غضب بسیار فرمود و حسن میمندی را بخطاب عنیف مخاطب داشت بلکہ نام آں بد فرجام بر جریدۂ اموات بزنگاشت ؎

چو فردوسی آمد روالا گہر	غمیں شد ز میمندیِ بے ہنر
اذیت ببے زانفر و مایہ دید	وز و بے سبب رنج و حرماں کشید
طبیعت مکافات آغاز کرد	سرش بادم تیغ انباز کرد"

تاریخی معاملات میں اس قدر دستبرد قطعاً ناجائز ہے مولانا کو اختیار تھا کہ روایات کو قبول یا رد کر دیں لیکن جب ایک مرتبہ قبول کر لیا تو لازم تھا کہ تمام قصہ نقل کرتے۔ حسن میمندی سبکتگین کے عہد میں بیشک قتل کیا گیا ہے لیکن ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا فردوسی کے معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ ناصر لک کا تاریخ میں کہیں پتہ نہیں چلتا نہ قدما میں کوئی مصنف اس کا قصہ بیان کرتا ہے۔

بعض وقت دو روایتوں کو لے کر مولانا نے ان کی کھچڑی سی پکا کر رکھدی ہے۔ اس غرض کے لئے دو مختلف روایتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

نظامی کا بیان ہے کہ فردوسی ہرات سے طوس جا کر وہاں سے بخط مستقیم طبرستان اسپہبد شہریار کے پاس چلا گیا جو مشہور آل باوند کا ایک رکن تھا۔ طبرستان میں فردوسی نے ہجو لکھکر اور دیباچہ میں اضافہ کر کے شاہنامہ شہریار کو پیش کیا کہ اس کتاب میں تمہارے بزرگوں کے حالات ہیں اس لئے تمہارے نام اس کا منسوب ہونا بہت مناسب ہے۔ شہریار نے اس کو تسلی دی اور کہا کہ کتاب تو محمود ہی کے نام پر رہنے دے البتہ سلطان ہجو میں ایک لاکھ روپیہ میں خریدتا ہوں خود سلطان کسی دن نادم ہوگا اور تیری رضاجوئی کریگا۔

دوسری روایت دیباچہ بایسنغری میں یوں ہے کہ فردوسی سلطان کے خوف سے ماژندران چلا گیا وہاں کا والی ان دنوں فرزندان شمس المعالی قابوس بن وشمگیر سے تھا دیباچہ کے اصلی الفاظ یہ ہیں:-

"والی ماژندران درآنزمان از فرزندان فرزان (کذا) شمس المعالی قابوس بن دشمگیر بن منوچہر (کذا) بن شمس المعالی بود و پسر او داماد سلطان بود و از طرف مادر دختر زادۂ مرزبان بن رستم

بن شروین کہ مصنف مرزبان نامہ است"

جب والی کو معلوم ہوا کہ طوس کا ایک شیعہ شاعر جس نے شاہنامہ غزنین میں نظم کیا تھا اپنی کتاب لے کر ماژندران آیا ہے اور فردوسی اور محمود کے تعلقات بھی اس کو معلوم ہوئے چونکہ شیعہ غلات سے تھا کہنے لگا چونکہ شاعر دوستدار اہلِ بیت ہے اگر اپنی تصنیف میرے پاس بھیجے گا معقول معاوضہ پائیگا۔ القصہ فردوسی نے والی اور اس کے اسلاف کی تعریف میں ابیات اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا والی بہت خوش ہوا لیکن بعد میں سلطان کے خوف سے معقول صلہ دے کر رخصت کر دیا۔

مولانا فرماتے ہیں:-

"ماژندران کی حکومت قابوس بن وشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانہ میں سپہبد فرمانروا تھا۔ اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بلایا۔ فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا۔ سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے نہ جانے دے لیکن پھر سلطان محمود کا خیال آیا ایک گراں بہا صلہ بھیجکر کہلا بھیجا کہ محمود آپ سے ناراض ہے اس لئے میں آپ کو ٹھیرا نہیں سکتا آپ اور کہیں تشریف لیجائیں"

قابوس کے خاندان میں کوئی اسپہبد نہیں گزرا۔ اسپہبد کسی شخص کا نام نہیں ہے بلکہ خاندانی خطاب ہے قابوس جو آل زیار سے تعلق رکھتا ہے جن کا پایۂ تخت جرجان تھا۔

باوندیہ خاندان کی حکومت کوہستان پریم اور شہریار کوہ میں تھی اس خاندان کے تمام حکمران اسپہبد کہلاتے تھے۔ مثلاً اسپہبد شہریار، اسپہبد رستم اور اسپہبد شروین وغیرہ۔ صاحب دیباچہ جس کی روایت کو مولانا نے نظامی عروضی کے بیان پر ترجیح دی ہے حسب معمول شبلی کو غلط راستہ پر لیجا رہا ہے اس غریب کو والی کا نام تک بھی معلوم نہیں اگرچہ اس کے بڑے بوڑھوں تک کے نام گنا گیا ہے اور وہ بھی غلط سلط۔ آل زیار میں دو بادشاہ سلطان محمود کے داماد ہوئے پہلا منوچہر بن قابوس ۴۰۳ھ و ۴۲۴ھ لیکن یہ شخص صاحب دیباچہ کا ہیرو نہیں سلطان کا دوسرا داماد امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس مصنف قابوس نامہ ہے۔ کیکاؤس ۴۱۲ھ میں پیدا ہوتا ہے عہد سلطان مودود ۴۳۲ھ و ۴۴۱ھ میں غزنین جاتا ہے اور انہیں ایام میں صبیہ سلطان

محمود سے غالباً اِس کی شادی ہوتی ہے اور عنقریب تخت نشین ہو جاتا ہے۔ اب صاحب دیباچہ کی مُراد اس کیکاؤس سے ہے کیوں کہ وہ سلطان کا داماد ہونے کے علاوہ مرزبان بن رستم بن شروین کا دختر زادہ بھی ہے۔ قابوس نامہ میں امیر عنصر المعالی اپنے فرزند گیلان شاہ سے کہتا ہے۔

> "جدہ مادرم دختر ملک زادہ المرزبان بن رستم بن شروین کہ مصنف مرزبان نامہ است و نیز جدم
> پدرش کیکاؤس بن قباد بود برادر ملک نوشیروان عادل و مادر تو فرزند ملک سلطان محمود بن
> ناصر الدین بودہ"

عنصر المعالی کا باپ امیر اسکندر ہے وہ کبھی بادشاہ نہیں ہوا۔ اگر صاحب دیباچہ کی مُراد عنصر المعالی سے ہے تو وہ فردوسی کی وفات سے جو ۴۱۱ھ میں مانی جاتی ہے ایک سال بعد پیدا ہوا اگر اس کے باپ اسکندر بن قابوس سے مُراد ہے تو وہ کبھی بادشاہ نہیں ہوا۔ یہ ہے معیار صاحب دیباچہ کی تاریخ دانی کا خدا جانے ایسے جاہل کو شبلی نے اپنا خضر راہ کیوں بنا لیا۔

فردوسی کا اٹھتر اسی سال کی عمر میں قہستان، طبرستان، مازندران اور بغداد جانا غیر اغلب معلوم ہوتا ہے دیباچہ قدیم اس باب میں خاموش ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیباچہ کے عہد تک فردوسی کے سفر کا قصہ اختراع نہیں ہوا تھا۔ صحیح صرف اِس قدر ہے کہ وہ غالباً سجستان یا خراسان امیر ابو المظفر نصر بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود کے پاس چلا جاتا ہے۔ شاہنامہ امیر پیش کرتا ہے صلہ مانگتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی التجا کرتا ہے کہ امیر سلطان سے ہی سفارش کرے چنانچہ شاہنامہ ؎

چو سالار شہ این سخنہائے نغز	بخواند بہ بیند بپاکیزہ مغز
زگنجش من ایدر بوم شادماں	کزو دور بادا بد بدگماں
وزاں پس کند یاد بر شہریار	مگر تخم رنج من آید ببار
کہ جاوید باد افسر و تخت اوئے	زخورشید تابندہ تر بخت اوئے

(داستان خسرو شیریں جلد چہارم صفحہ ۱۰۴۱)

بعض اوقات مولانا اپنے راویوں کے بیانات میں تصرف بیجا یا دخل بیجا بھی کر لیا کرتے ہیں جن کے ذمہ دار

ان کی سہل انگاری اور بے پروائی مانی جا سکتی ہے اس قسم کی بعض مثالیں پیشتر گزر چکی ہیں ذیل میں تازہ مثال پیش ہے:-

"ایک دفعہ سلطان محمود ہندوستان کی مہم سے واپس آرہا تھا راستہ میں دشمن کا قلعہ تھا وہیں ٹھہر گیا اور قاصد بھیجا کہ حاضر خدمت ہو کر اطاعت بجا لائے دوسرے دن قاصد جواب لایا لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ محمود نے وزیر اعظم سے کہا کہ دیکھ کیا جواب لایا ہے وزیر نے برجستہ کہا ع

اگر جز بکام من آید جواب　　　من و گرز و میدان و افراسیاب

محمود پھڑک اٹھا اور پوچھا کس کا شعر ہے وزیر نے کہا اس بد قسمت کا جس نے ۲۵ برس خون جگر کھایا اور کچھ نہ حاصل ہوا محمود نے کہا مجھکو سخت ندامت ہے غزنین پہونچکر یاد دلانا غرض پائے تخت میں پہونچکر ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کیں لیکن تقدیر پر کس کا زور ہے ادھر شہر کے ایک دروازہ سے جس کا نام رودبار تھا صلہ پہونچا ادھر دوسرے دروازہ سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا" (شعر العجم صفحہ ۱۰۹ و ۱۱۰)

یہ روایت فردوسی کے بہت قریب زمانہ تک پہونچ جاتی ہے اس لئے کہ ۵۱۴ھ میں نظامی نے امیر معزی سے سنی اور معزی نے امیر عبد الرزاق سے۔ میں اس کے بعض خط و خال جو اصل روایت سے مختلف ہیں بیان دکھاتا ہوں۔ نظامی نے لکھا تھا کہ ۵۱۴ھ میں میں نے یہ واقعہ سنا مولانا نے حاشیہ میں اس کے بجائے ۵۱۲ھ لکھا۔ نظامی نے لکھا تھا کہ "محمود کے راستہ میں کسی متمرد رئیس کی عملداری تھی جو ایک مضبوط قلعہ کا مالک تھا اور محمود کا پڑاؤ دوسرے روز اسی قلعہ کے نیچے تھا اس لئے قاصد پیشتر روانہ کر دیا کہ رئیس کل حاضر خدمت ہو کر رسوم بندگی بجا لائے اور خلعت لے کر واپس چلا جائے دوسرے روز محمود نے کوچ کیا خواجہ بزرگ بادشاہ کے دست راست پر چل رہا تھا کہ ایلچی واپس آتا اور سلطان کی طرف بڑھتا نظر آیا خواجہ سے سلطان نے پوچھا کیا جواب دیا ہوگا خواجہ نے جواب میں شعر مذکورہ بالا پڑھ دیا۔ اس بیان سے بعض جزویات میں مولانا کو اختلاف ہے جہاں نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی نے پچیس سال محنت کی وہاں شبلی نے پندرہ

سال لکھے۔ نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی کے لئے ساٹھ ہزار دینار کی نیل سرکاری اونٹوں پر بھجوائی مولانا نے اس کے بجائے ساٹھ ہزار اشرفیاں بھجوانا ظاہر کیا۔ اشرفی اور دینار میں جو فرق ہی ظاہر ہے۔ دینار ہمارے سکّوں میں ڈھائی تین روپے کے برابر ہی اور اشرفی پچیس تین روپیہ کی نہ اشرفیاں اس عہد میں رائج تھیں نظامی کے ہاں شہر کا نام طبران اور اس کے دوسرے دروازہ کا نام رزان ہی مولانا نے ان ناموں کا ذکر تک نہ کیا۔ اگر ہم کسی مصنف کے اقتباسات کے ساتھ اس طرح بے پروائی کریں اور یہی طریقہ کچھ دن جاری ہی تو اصلی روایت چند ہی روز میں بالکل مسخ ہو جائے گی۔ مثال کے لئے میں شعر مرقومہ بالا پیش کرتا ہوں کہ بے پروا اور غافل راویوں کے ہاتھوں اس شعر میں اس قدر تصرّف او رتغیّر ہوا ہے کہ فردوسی موجودہ حالت میں صرف ایک مصرع کا مالک رہ گیا ہی جس کا اثر روایت کے اعتبار پر بھی پڑتا ہے شاہنامہ میں فردوسی نے دو طرح اس کو لکھا ہی ؎

(۱) چو فردا برآید بلند آفتاب — من وگرز و میدان و افراسیاب

(شاہنامہ جلد اول صفحہ ۱۳۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۲) بجویم برین کینہ آرام و خواب — من وگرز و میدان و افراسیاب

(جلد دوم صفحہ ۲۰۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

شبلی ارشاد کرتے ہیں:۔

"ناصر خسرو نے سفرنامہ میں لکھا ہی کہ ۴۳۷ھ میں جب میں طوس میں پہونچا تو ایک بڑی کارواں سرا دیکھی لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ فردوسی کے صلہ سے تعمیر ہوئی ہی۔ فرہنگ رشیدی اور چہار مقالہ میں لکھا ہی کہ اس کا نام چاہ ہی اور مرو اور نیشاپور کے راستہ میں ہی" (شعر العجم صفحہ ۱۱۱)

ناصر خسرو کے نام مولانا یہ روایت لکھتے ہیں۔ ناصر خسرو کا سفرنامہ مؤلفہ مولانا الطاف حسین حالی طبع ۱۸۸۲ء میری زیر نظر ہی اس میں رباط چاہ یا کسی اور رباط کا جو فردوسی کے صلہ سے تعمیر ہوئی ہو مطلق ذکر نہیں۔ شبلی اپنی اقتباسات کو ایک بے پروائی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھتے ہیں خدا جانے کہاں سے حوالہ لیا اور کس کے نام سے لکھا۔ مولانا نے بسم اللہ ہی غلط کی۔ ناصر خسرو کا سفر ۴۳۷ھ سے شروع ہوتا ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ ۴۳۷ھ میں ناصر خسرو طوس پہونچا۔ مرو سے حکیم ناصر خسرو ۲۳ رشعبان ۴۳۷ھ کو نیشاپور کے

ارادہ سے نکلا اور سرخس ہوتا ہوا شنبہ گیارہ شوال سال مذکور کو نیشاپور پہونچ گیا۔ سرخس اور نیشاپور کے رستہ میں طوس[1] جہاں رباط چاہ بتائی جاتی ہے نہیں آتا اسی لئے حکیم مذکور نہ طوس اور نہ اس کی رباط کا ذکر کرتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"پس بمرو رفتم واز آں شغل کہ بعہدۂ من بود معاف خواستم وگفتم کہ مرا عزم سفر قبلہ است پس حسابیکہ بود جواب گفتم واز دنیاوی آنچہ بود ترک کردم الّا اندک ضروری وبست و سوم شعبان بعزم نیشاپور بیروں آمدم واز مرو بسرخس شدم کہ سی فرسنگ باشد واز آنجا بہ نیشاپور چہل فرسنگ است روز شنبہ یازدہم شوال در نیشاپور رسیدم چہارشنبہ آخر ایں ماہ کسوف بود وحاکم زماں طغرل بک محمدؐ بود برادر چغری بک"۔ (سفرنامہ صفحہ ۳۴)

فرماتے ہیں:۔

"نظامی عروضی کا بیان ہے کہ علی دیلمی شاہنامہ کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا اور بودلف راوی تھا یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا اور جلسوں اور صحبتوں میں لوگوں کو سناتا تھا لیکن شاہنامہ میں فردوسی نے ان دونوں کا نام اس انداز سے لیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فردوسی کے سرپرست اور مربی تھے کاتب اور راوی نہ تھے ؎

ازاں نامور نامداران شہر ۔۔۔ علی دیلم و بودلف راست بہر

بودلف کی نسبت قاضی نوراللہ شوستری کا قیاس ہے کہ یہ وہ بودلف ہے جو ایک محتشم رئیس تھا جس کے نام پر اسدی طوسی نے گشتاسپ نامہ (کذا) اور دیباچہ میں اس کی مدح وثنا کی ہے ؎

ملک بودلف شہریار زمیں ۔۔۔ جہاندار آزادی پاکدیں

---

[1] سرخس اور نیشاپور کے راستہ کی منزلیں حسب ذیل ہیں۔ سرخس سے رباط آبگینہ (چھ فرسنگ) رباط آبگینہ سے رباط توران (سات فرسنگ) رباط توران سے رباط ماہی (سات فرسنگ) رباط ماہی سے رباط سنگ بست (چھ فرسنگ) رباط سنگ بست سے دیہ خاکستر (تین فرسنگ) دیہ خاکستر سے دیہ باد (پانچ فرسنگ) دیہ باد سے نیشاپور (سات فرسنگ) ان منازل میں جو میں نے نزہت القلوب حمداللہ مستوفی سے لی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شہر طوس راستہ میں نہیں آتا۔

بزرگے کہ با آسماں ہمسر است ز نسلِ براہیم پیغمبر است" (شعر العجم صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶)

شاہنامہ میں بودلف کا ذکر یوں آتا ہے

ازاں نامور نامداران شہر علی دیلی بودکو راست بہر

کہ ہموارہ کارم بخوبی رواں ہمی داشت آمر د روشن رواں

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ "بودکو" کے بجائے بودلف چاہیئے۔ میں یہ بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ علی دیلم اور بودلف ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں علی اس کا نام اور کنیت بودلف ہے کیوں کہ شعر ما بعد میں ضمیر اور فعل واحد آئی ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ کاتب ہو کیوں کہ جو اسمائے صفات اس کے لئے استعمال ہوئے ہیں مثلاً "راست بہر" اور "آمر د روشن رواں" ان سے ظاہر ہے کہ وجاہت دُنیاوی کے لحاظ سے علی دیلمی کوئی موقر رُتبہ نہیں رکھتا تھا۔ میں قاضی صاحب کے نظریہ میں شریک نہیں ہو سکتا کیوں کہ کنیت کی مماثلت اوّل تو کوئی وقیع اور وزنی دلیل نہیں ہو سکتی علاوہ بریں گرشاسپ نامۂ اسدی جیسا کہ اسدی کے حالات میں دکھایا جا چکا ہے ۴۵۸ھ میں تصنیف ہوتا ہے۔ بُعد زمانی کے علاوہ مراتب دنیاوی میں اختلاف ایک کو دوسرے سے امتیاز دینے کے لئے کافی ہے۔

تاریخ عجم پر بعض قدیم عربی تراجم و تصنیفات کے نام گنا کر علامہ شبلی فرماتے ہیں :-

"ان تمام قراین اور تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں جو عربی میں ترجمہ ہو گئی تھیں لیکن فردوسی کا قومی غرور عرب کے احسان کو گوارا نہیں کرتا۔ فردوسی کا دعویٰ ہے کہ قدیم زمانہ کی ایک نہایت مبسوط تاریخ ایران کی موجود تھی لیکن مرتب اور مدوّن نہ تھی۔ موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزا تھے ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بڈھے بڈھے پر اتم موبد جمع کئے اور اُن پراگندہ اجزا کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب طیار کرائی۔" (شعر العجم صفحہ ۱۲۳)

فردوسی کو اس کے قومی غرور کے اثرات میں عربوں کی احسان ناشناسی کا ملزم قرار دیتے ہیں۔ مولانا شبلی صریح بے انصافی سے کام لے رہی ہیں اس لئے کہ عربوں کے احسان کا کوئی سوال یہاں شروع ہی سے پیش

نہیں آتا۔ تاریخ ایران پر تراجم و تالیفات کرنے والی تمام ایرانی تھے عربی زبان اس عہد کے ایران کی علمی اور ادبی زبان تھی۔ عبداللہ بن المقفع۔ محمد بن جہرم البرمکی۔ ہشام بن قاسم سپاہانی۔ بہرام شاہ بن مردان شاہ۔ بہرام بن بہرام سپاہانی۔ بہرام الموبد۔ زادویہ بن شاہویہ اصفہانی۔ طبری۔ مسعودی۔ ابوحنیفہ دینوری۔ موسیٰ بن عیسی الخسروی۔ ابوالموید بلخی قریب قریب تمام ایرانی اور ایران زا ہیں۔ فردوسی کو اپنے ملکی بھائیوں کی تصنیفات سے امداد لینے میں قومی غرور کیوں مانع آتا۔ نہ عربی ذرائع کا نظرانداز کرنا فردوسی کے لئے ممکن تھا۔ مثلاً سکندر کے حالات شاہنامہ میں اسلامی روایات کے مطابق ہیں جو کسی پہلوی نسخہ سے منقول نہیں ہو سکتے مجوسیوں کے ملعون اور مردود سکندر اور فردوسی کے سکندر میں جو خانہ کعبہ کی زیارت کو بھی جاتا ہے بڑا فرق ہے۔

رہا یہ امر کہ فردوسی نے عربی تصنیفات سے زیادہ کام کیوں نہیں لیا اس کے جواب تو بہت ہو سکتے ہیں لیکن میں اس کی استطاعت ماحول اور زمانہ کے مشکلات کا مختصر سا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ تعلیم ہمارے زمانہ کی طرح ان ایام میں عام نہیں تھی اس لئے کتابوں کا عزیزالوجود ہونا لازمی تھا علمی کتابوں کا ہر مقام پر دستیاب ہونا بھی دشوار تھا سامانی شاہی کتب خانہ میں اگر یہ تمام ذخیرہ موجود تھا تو فردوسی جیسے غریب شاعر کے لئے ان تک رسائی معلوم۔ شاہنامہ کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کے مقصد سے اس نے بلخ بخارا اور ہرات وغیرہ شہروں کا سفر بھی کیا ہے۔ سیاحوں اور شایقین کے لئے سفر کرنا اور اپنی تلاش جاری رکھنا ان ایام میں محال تھا خراسان پر تین زبردست شخص اپنا استحقاق جتا رہے تھے اور اپنے حقوق کے محافظت میں ایک دوسرے کو زبان شمشیر سے جواب دے رہے تھے۔ حسام الدولہ ابوالعباس تاش سپہ سالار، ابوعلی سیمجوری اور نائق بدنصیب خراسان کے طاقتور دعویدار تھے۔ جنگ و فساد کی آگ ہر طرف بھڑک رہی تھی ؎

زمانہ سرا ے پر از جنگ بود ۔۔۔ بجویندگاں برجہاں تنگ بود (شاہنامہ جلد اوّل صفحہ ۳)

فردوسی کو اپنی تاریخ کے لئے کسی معتبر اور مکمل تصنیف کی ضرورت تھی جو تمام قصص و افسانہ و تاریخ ایران پر حاوی ہو۔ مؤرخ کو اپنی تاریخی سرمایہ کے لئے قدیمی ذرائع بھی درکار ہیں اس ضرورت سے اس نے اپنے آپ کو زردشتی روایات کا پابند کر لیا چنانچہ ایسی ہی کتاب پسند کی جس کے راوی اور مدون پارسی اور مجوسی تھے۔ فردوسی کا یہ قول کہ قدیم تاریخ ایران ایک پریشان اور بے ترتیب حالت میں تھی میری رائے میں بالکل صحیح ہے۔ شبلی نے

جس قدر تصانیف کا نام لیا ہے ان کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ عربی ذرائع تاہم فردوسی کے مقصد کے لئے ناکمل تھے۔ فردوسی خود باوجود جدوجہد تمام سلسلۂ روایات ایران پر حاوی نہ ہو سکا۔ اگرچہ نامۂ خسرواں کے علاوہ متعدد مقامات پر زندہ راویوں سے بھی مدد لی ہے۔ تاہم کئی داستانیں فردوسی سے چھوٹ گئیں مثلاً گرشاسپ نامہ کی داستانیں فردوسی کو دستیاب نہیں ہوئیں چنانچہ (اسدی) ؎

بشہنامہ فردوسی نغز گوی ۔۔۔ چو از پیش گویندگاں برد گوی

بسے یاد در رزم یلاں کردہ بود ۔۔۔ وزیں در سخن یاد نا وردہ بود

نہالے بد ایں رستہ ہم زاند رخت ۔۔۔ شدہ خشک وبے بار و پژمردہ سخت[۱]

ابو علی بلعمی بھی کہتا ہے کہ گرشاسپ کی داستان ابو المؤید بلخی نے اپنے شاہنامۂ بزرگ میں مفصل بیان کی ہے علیٰ ہذا شہریار نامہ اور بہمن نامہ کے واقعات ہیں جو فردوسی کی نظر سے نہیں گزرے اور سلجوقی عہد میں دوسرے شعرا نے ان کو نظم کیا۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ایران کی تاریخ پر کوئی سندی اور جامع کتاب موجود نہیں تھی اس کے علاوہ پہلوی اور عربی زبانوں میں چھوٹے چھوٹے رسالوں اور داستانوں کا وجود کافی شہادت ہے اس خیال کی کہ سلسلۂ روایات ایران کے مکمل تدوین نہیں ہوئی تھی جستہ جستہ داستانیں مثلاً شہزاد و پرویز۔ کارنامۂ اردشیر، مزدک نامہ، گنج شائگاں، شطرنج نامہ، کارنامک انجشتر، یادگار زریراں اندرز خسرو قباتان ثابت کرتی ہیں کہ تاریخ عجم ایک منتشر حالت میں تھی اور اس کی داستانیں مختلف لوگوں کے پاس ملتی تھیں ؎

پراگندہ در دست ہر موبدے ۔۔۔ وزو بہرۂ بردہ ہر بخردی

(شاہنامہ جلد اوّل صفحہ ۳)

فردوسی کا یہ دعویٰ کہ ایک دہقان رئیس نے پرانے موبدوں کو جمع کر کے ایران کی تاریخ پر ایک کتاب تدوین کی بالکل راست معلوم ہوتا ہے۔ دیباچۂ قدیم شاہنامہ اس بارہ میں کافی روشنی ڈالتا ہے۔ ابو منصور عبدالرزاق کے ذکر میں اس دیباچہ میں لکھا ہے۔

---

[۱] گرشاسپ نامۂ حکیم اسدی ص ۱۰ و ۱۱ طبع آقا میرزا محمد ملک الکتاب۔ بمبئی ۱۳۱۵ھ

ابُومنصور عبدالرزاق مردے بود با فر و خوش کام و بزرگ اندر کام روائی و با دستگاہ تمام
از بادشاہی و اندیشۂ بلند داشت و بگوہر از تخم گردان ایران بود۔ ۔۔ ۔ از روزگار آرزو
کردتا او را نیز یادگارے بماند دریں جہاں پس دستور خویش ابومنصور المعمری را بفرمود تا بخداوندان
کتب نامہ کرد و کس فرستاد از دہقان و فرزانگان و جہاں دیدگاں از شہرہا بیاوردند و چاکر
او ابومنصور المعمری را بفرمود تا نامہ گرد کرد و کس فرستاد بشہرہائے خراساں و ہشیاراں را ازانجا
بیاورد از ہر جائے چوں شاخ (ماخ ؟) پسر خانی (؟) از ہرات و چوں یزداں داد پسر شاپور
از سیستاں و ماہوی خورشید پسر بہرام از شاپور (نیشاپور) و شاداں پسر برزین از طوس و نشاند
بفراآوردن ایں نامہا (از کیومرث) ۔۔ نخستیں کہ اندر جہاں آمد او بود کہ آئین مردے آورد
و مردماں را از جانوروان پدید کرد تا یزدگرد کہ آخر ملوک کیاں بود اندر ماہ محرم کہ سال
بر سیصد و چہل و شش (بود) از ہجرت خواجۂ دنیا و عقبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم وایں را
شاہنامہ نام نہاد۔"

دیباچۂ قدیم کا یہ بیان فردوسی کے قول کی پوری پوری تصدیق کرتا ہے اور یہی شاہنامہ فردوسی کا
قدیمی ماخذ ہے :-

قولہ "ساسانیوں (کذا) کو ایران کی تاریخ مرتب کرنے کا ہمیشہ خیال رہا۔ ان میں سے نوشیرواں کو
سخت شغف تھا چنانچہ تمام اطراف و دیار میں قاصد بھیجکر ہر جگہ سے "تاریخی ذخیرے جمع کئے"
یزدگرد نے اپنے زمانہ میں ان سب کو دانشور دہقان کے حوالہ کیا کہ کیومرث سے لے کر خسرو
پرویز کے زمانہ تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کردے ۔ دانشور مذکور مداین کے رؤسا
میں تھا اور نہایت صاحب حوصلہ اور فاضل شخص تھا اس نے ان تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب
دے کر ایک مبسوط اور جامع تاریخ طیار کی۔" (شعر العجم صفحہ ۱۲۵)

"تاریخ ایران کے متعلق نوشیرواں کا اشتیاق اور اس کے لئے ذخیرہ جمع کرنے کا ذکر کسی کتاب میں میری
نظر سے نہیں گزرا۔ علیٰ ہذا دانشور دہقان اور اس کی کتاب تدوین کرنے کا قصہ بھی کتب تواریخ میں نہیں ملتا

فردوسی نے شاہنامہ میں نوشیرواں کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں اُس کی دانشمندی اور دانش پرستی کی بھی بڑی تعریف کی ہے لیکن واقعۂ بالا کا ذکر نہیں کیا۔ شاہنامہ اس قدر قابل یقین ہے کہ ہرمز پسر نوشیرواں عادل نے قید کے ایام میں اپنے فرزند خسرو پرویز سے درخواست کی کہ وہ ایک فوجی آدمی جس کو پرانی جنگوں کے قصّے یاد ہوں بھیجدے اور ایک بوڑھا آدمی جو بادشاہوں کے حالات میں دستگاہ رکھتا ہو ان کی تاریخ لکھکر لائے (شاہنامہ)

دیگر سوارے ز گردن کشاں — کہ از رزم دیرینہ دارو نشاں
برِ من فرستی کہ از کارزار — سخن گوید و کردہ باشد شکار
ہماں نیز دانندہ مردے کہن — کہ از شہریاراں گزارد سخن
نوشتہ یکے دفتر آرد مرا — بداں درد و سختی سر آرد مرا

(شاہنامہ صفحہ ۲۲)

قولہ "عربوں کے حملہ میں یہ کتاب حضرت عمر کی خدمت میں پیش کی گئی آپنے اس کا ترجمہ سُنا اور فرمایا کہ یہ مزخرفات کا مجموعہ دیکھنے کے قابل نہیں۔ غرض یہ کتاب لوٹ میں تقسیم ہو کر حبش پہونچی بادشاہ حبش نے اس کا ترجمہ کرایا وہاں سے ہندوستان پہونچی یعقوب لیث نے اپنے زمانۂ حکومت میں اس کو ہندوستان سے منگوا کر ابومنصور عبدالرزاق بن عبدالرزاق بن عبداللہ فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے چنانچہ تاج بن خراسانی ہردی یزداں داد شاپور سیستانی، ماہوی بن خورشید نیشاپوری، سلیمان طوسی، ان سب نے مل کر ۳۶۰ھ میں اس کا ترجمہ کیا۔ یہی کتاب سامانیوں کو ہاتھ آئی اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا اس روایت کا یہ حصہ کہ کتاب حبش گئی وہاں ترجمہ ہو کر پھر ہندوستان پہونچی ہندوستان سے ایران میں آئی صریح غلط اور بیہودہ ہے باقی واقعات صحیح ہوں تو عجب نہیں۔"

(شعر العجم صفحہ ۱۲۸)

شکر ہے کہ اس موقعہ پر شبلی نے اپنے مایۂ ناز دیباچہ کے خلاف کسی قدر صدا بلند تو کی لیکن میں ان باقی واقعات پر نظر ڈالتا ہوں۔ صاحب دیباچہ نے یعقوب بن لیث کو ایک صدی پایۂ فردین میں رکھا ہے یعقوب ۲۶۵ھ میں رہگرائے ملک عدم ہوتا ہے۔ بھلا ۳۶۰ھ میں یعقوب اپنی قبر سے اُٹھکر ابومنصور عبدالرزاق کو حکم دیگا کہاں سے

آگیا، صاحب دیباچہ کو اپنے قصوں کے توڑ جوڑ میں تاریخ کا لحاظ نہیں رہا۔ ابو منصور عبدالرزاق نے ترجمہ کا حکم نہیں دیا ہی بلکہ تدوین اور تصنیف کا۔ اس معاملہ میں دیباچہ قدیم اور شاہنامہ دونوں متفق ہیں ۳۴۶ھ میں یہ تصنیف طیار ہوئی تھی نہ ۳۶۰ھ میں۔ تاج خراسانی کو دیباچہ قدیم میں شاخ پسر خانی لکھا ہی لیکن شاہنامہ میں اس کا نام "ماخ" ہی ؎

یکے پیر بد مرزبانِ ہری — پسندیدہ و دیدہ از ہر دری
جہاں دیدہ و نام او بود ماخ — سخندان با برگ و با برز و شاخ
بپرسیدمش تا چہ دارد بیاد — ز ہرمز کہ بنشست بر تخت داد

(بادشاہی ہرمز دانوشیرواں جلد چہارم صفحہ ۴۰۵)

فردوسی نے اس سے داستان ہرمز حاصل کی ہی۔ مولانا کا سلیمان طوسی دیباچہ بایسنغری میں سلیمان بن نورتن ہی مگر دیباچہ قدیم میں صاف شادان پسر برزین ہے مزید شہادت کے لئے شاہنامہ موجود ہی۔ بیت

نگہ کن کہ شاداں برزیں چہ گفت — بدانگہ کہ بکشاد راز از نہفت

(فرستادن نوشیرواں برزوی پزشک را بہ ہندوستاں برائے آوردن واردی شگفت و فرستادن برزو کتاب کلیلہ و دمنہ را بنزداد (جلد چہارم ص ۳۳۵)

گویا شادان بن برزین کے حوالہ سے داستان کلیلہ و دمنہ فردوسی نے لکھی ہی مولانا کی بیان کا یہ حصہ کہ یہی کتاب سامانیوں کے ہاتھ آئی اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا ذرا غور طلب ہی۔ خدا جانے صاحب دیباچہ نے یہ بیان کہاں سے اخذ کیا ہی اگر صحیح ہے تو مولانا شبلی فردوسی پر عربوں کے احسان نہ ماننے کی معاملہ میں ناحق ناراض ہوئے جب سامانی اور دقیقی اس کو مستند کتاب مانتے آئے ہیں تو پھر فردوسی نے معتبر مان کر اپنے شاہنامہ کی بنیاد اگر اسی کتاب پر ڈالی تو کیا قصور کیا۔

خود فیروز کا سلطان محمود کی خدمت میں تاریخ عجم پیش کرنا یا پادشاہ کرمان کا مؤرخ آذر برزین کو جو عجم کی تاریخ پر سب سے بڑے سرمایہ کا مالک تھا سلطان کے دربار میں روانہ کرنا ضعیف روایتیں معلوم ہوتی ہیں ایک بات البتہ صاف ہی وہ یہ ہے کہ محمود کو تاریخ ایران سے کوئی خاص ذوق یا لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔

شبلی فرماتے ہیں :-

ایران میں عربی نہایت شدت سے مخلوط ہوگئی تھی عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اس کے چار شعر آج موجود ہیں جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں رودکی اور ابوشکور وغیرہ کا کلام عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے سلطان محمود کے زمانہ میں ایک فاضل نے شاہنامہ کے جواب میں عمر نامہ ایک کتاب نثر میں لکھی تھی وہ ہمارے نظر سے گزری ہے اس کا بھی یہی حال ہے اسی زمانہ میں شیخ بوعلی سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی میں لکھی جائے لیکن عہدہ برآ نہ ہو سکا۔" (شعر العجم ص ۱۴۲)

ایران میں شروع ہی سے عربی کا شدت سے مخلوط ہونا غلط معلوم ہوتا ہے عباس مروزی کے اشعار اس بارہ میں سند نہیں مانی جا سکتی اس لئے کہ متاخرین کے ہاتھوں ان میں اس قدر ترمیم ہوگئی ہے کہ قدامت کی بو تک باقی نہیں رہی۔ رودکی کے متعلق مولانا کو جو سہو ہے وہ ظاہر ہے قطران تبریزی کے قصائد کی بنا پر ایسا فرماتے ہیں لیکن وہ سلجوقی عہد کی زبان ہے اس دور میں عربی فارسی زبان میں بہت دخیل ہوگئی تھی۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر مولانا نے یہ نظریہ قایم کیا کہ دقیقی فارسی زبان کے گلزار کو عربی الفاظ کے خس و خاشاک سے پاک کرنے والا ہے۔ رہا ابوشکور بلخی اس کے کلام کا جس قدر نمونہ شعر العجم صفحہ ۵۴ و ۵۵ میں دیا گیا ہے اس میں عربی کا ایک لفظ بھی قسم کھانے کو نہیں ملتا۔ عربی کا اثر ابتداً ایں فارسی پر کچھ نہیں تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ اثر بتدریج ترقی کرتا گیا حتیٰ کہ پانچویں اور چھٹی صدیوں میں اس نے ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا۔ عمر نامہ اور حکمت علائیہ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں اس لئے کہ وہ پانچویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں اور نثر میں ہیں حکمت علائیہ کی نسبت یہ خیال کہ شیخ بوعلی سینا نے خالص فارسی میں لکھنے کا قصد کیا مجھکو غیر تاریخی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اوّل تو فلسفیانہ اصطلاحات کی فارسی زبان میں عدم موجودگی کی بنا پر ایسا قصد کرنا دیوانگی سے کم نہیں تھا دوسرے شیخ نے اس تصنیف میں ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا وہ صرف یہ کہتا ہے :-

"بایدکہ من خادم ایں مجلس بزرگوار کتابے تصنیف کنم بپارسی کہ اندر وے اصلہا و نکتہائے پنج علم از علمائے پیشینگاں گرد آورم بغایت مختصر۔" (مایۂ دانش علائی مطبع فیروز دکن)

اس کے بعد شبلی فرماتے ہیں :-

عُام خیال ہی کہ فردوسی بزم اچھی نہیں لکھتا بے شبہ یوسف زلیخا میں اس کی شاعری کا رُتبہ بہت گھٹ گیا ہی لیکن یہ اس کے رنج اور دل شکستگی کا زمانہ تھا جب اس کے تمام جذبات افسردہ ہو چکے تھے یوسف زلیخا لکھنے سے اس کا مقصد صرف مذہبی جماعت کو خوش کرنا تھا جو اتنی بات پر فردوسی سے ناراض تھے کہ اس نے مجوسیوں کی مدح وثنا میں کیوں اس قدر اوقات صرف کی ''

میں اپنے خیالات اس کتاب کے متعلق اسی رسالہ کے اپریل ۱۹۲۲ء میں درج کر چکا ہوں اور میرا عقیدہ ہی کہ یوسف زلیخا فردوسی کے قلم سے نہیں نکلی جب میں نے اپنا مضمون یوسف وزلیخا لکھا تھا اس وقت ڈاکٹر ایتھی کا نسخۂ یوسف زلیخا میرے پاس نہیں تھا جس کا مجھکو سخت افسوس رہا اس زلیخا میں سبب تالیف بھی موجود ہے جو بدقسمتی سے ایرانی اور ہندوستانی نسخوں میں موجود نہیں میں اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتا ہوں ۔

یُوسف زلیخا کو اس سے قبل دو شاعر نظم کر چکے ہیں پہلا ابو المویدبلخی ؎

یکے بوالموید کہ از بلخ بود — بدانش ہمی خویشتن راستود

اِس کے بعد بختیاری شاعر نے نظم کیا ؎

پس از وے سخن بافِ این داستاں — یکے مرد بد خوب روئے جواں

نہادہ ورا بختیاری لقب — کشادی بر اشعار ہر جائے لب

نوروز کی تقریب میں بختیاری امیر عراق کے پاس اہواز گیا ؎

خداوند فرخ امیر عراق — کہ تخش سپہرست و اسپش بُراق

جہانگیر و قطب و دل بحرجاہ — نگہدار دولت ستونِ سپاہ

ہنرمند سرہنگ باآفریں — سپہدار سلطان رُوئے زمیں

پادشاہوں کی طرح امیر تخت پر بیٹھا تھا اور باقاعدہ دربار لگ رہا تھا عہدہ دار صف باندھے کھڑے تھے سرودنہ اپنی موسیقی سے حاضرین کو محظوظ کر رہی تھے شعرا علیحدہ صف میں استاد

نظر آتے تھے اور قصیدے سُنا رہے تھے بختیاری نے بھی حسب معمول قصیدہ سنایا۔ شعرا کو انعام تقسیم ہوئے اور جلسہ برخاست ہوا۔ ایک روز نوروز کے چند دن بعد کوئی خوش الحان قاری امیر کو سورۂ یوسف سُنا رہا تھا امیر کے دل میں اس وقت یہ خیال گزرا کہ اگر یہ سُورت فارسی میں اس طرح نظم کر دی جائے کہ تفسیر اور مطالب پر حاوی ہونے کے علاوہ شاعری کا بھی حق ادا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ وہ یہ خیال کر رہی رہا تھا کہ بختیاری شاعر بھی آنکلا امیر نے اپنا خیال اس پر ظاہر کیا اور بختیاری نے بڑی مستعدی کے ساتھ اس قصہ کو نظم کر دیا۔ شاعر کہتا ہے اتفاقاً ایک روز میں بختیاری کی زلیخا کا قصہ تاج زمانہ اجل موفق سے کر رہا تھا ؎

قضا را یکے روز اخبار آں — ہمی راندمش بے غرض بر زباں
بنزدیک تاج زمانہ اجل — موفق[1] بشہر وفا و عمل

---

[1] بقول پروفیسر براون ڈاکٹر ایتھی کا خیال ہے کہ زلیخا فردوسی نے مجد الدولہ ابو طالب رستم ۳۸۷ھ و ۴۲۱ھ کے لئے نظم کی پروفیسر نلدیکی کا اعتقاد ہے کہ بہاؤالدولہ ۳۷۹ھ و ۴۰۳ھ یا اس کے فرزند سلطان الدولہ ۴۰۳ھ و ۴۱۶ھ کے واسطے لکھی ایتھی کے خیال کی مؤید کوئی تاریخی دلیل موجود نہیں اس سے اعراض کر کے میں نلدیکی کے نظریہ کا ذکر کرتا ہوں جس کی تائید میں یہ باتیں ملتی ہیں۔ موفق بہاؤالدولہ کا وزیر ہے جس کا پُورا نام ابو علی (الحسن بن محمّد) بن اسمٰعیل ہے۔ اہواز کو بہاؤالدولہ کی تاریخ میں زبردست اہمیت بھی حاصل ہے۔ بختیاری شاعر نے جس کا دیباچۂ زلیخا میں ذکر ہے عزالدولہ بختیار ۳۶۷ھ کے نام پر اپنا تخلص رکھا ہوگا جو اس عہد میں بویہ خاندان کا ایک امیر تھا۔

اس نظریہ کے خلاف میں اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ الاجلّ تاج الزمان موفق جس کا دیباچہ میں ذکر ہے اور موفّق وزیر بہاؤالدولہ ایک شخص نہیں ہو سکتے کمال الزمان یا تاج الزمان کی قسم کے القاب پانچویں اور چھٹی صدی میں ملتے ہیں۔ موفّق بن اسمٰعیل وزیر بہاؤالدولہ ۳۹۰ھ میں پہلی مرتبہ اور ۳۹۲ھ میں دوسری مرتبہ گرفتار ہوتا ہے اور عنقریب وفات پاتا ہے یوسف زلیخا کو شاہنامہ کے اختتام یعنی ۴۰۰ھ کے بعد لکھے جانے کا اعتراف ہے اس عہد سے بہت قبل موفّق کا انتقال ہو جاتا ہے زلیخا میں جس موفّق کا ذکر ہے وہ کوئی عالم معلوم ہوتا ہے جو صاف الفاظ میں شاعر سے کہتا ہے کہ میں تمہاری مثنوی کو وزیر امیر عراق کے پاس لیجاؤں گا ؎

برم نزد دستورِ میرِ عراق — کہ گردانش خیلند و ایران و شاق

فردوسی ۳۸۴ھ سے ۳۹۴ھ تک غزنین میں موجود ہے اور اس زمانہ میں سلطان محمود سے اس کے خوشگوار تعلقات قایم ہیں اس لئے اسی زمانہ میں اس کا اہواز جا کر مثنوی یوسف و زلیخا بہاؤالدولہ کے لئے تصنیف کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

اس ذکر سے میری کوئی خاص غرض تو تھی نہیں۔ یہ سن کر امام نے مجھ سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں
تم بھی کسی شغل میں لگو اور بہتر تو یہ ہوگا کہ سرمایہ جمع کرکے اس قصہ کو نظم کر ڈالو لیکن نظم کو
دانش سے ترکیب دینا اسقام وخطا سے بری رکھنا تاکہ دوسرے شعرا کو غلطی نکالنے اور اعتراض
کرنے کی گنجایش نہ رہے۔ ترکیب اور بندش چست ہو معانی اور نکات دل پسند ہوں اشعار
دلچسپ اور بولتے قافئے ہوں کلام نقص اور گنجلک سے پاک ہو علاوہ بریں دلکش پاکیزہ
اور رواں ہو تاکہ میں وزیر امیر عراق کے پاس لیجاؤں اور کچھ حصہ اس کے سامنے پڑھا جائے
اس سے تمہاری شاعری کا پایہ اس پر محقق ہو جائے گا اور تمہیں یہ فائدہ ہوگا کہ اس کی
عنایت تم پر ہو جائے گی۔ میں نے اس عالم اجل کی یہ گفتگو سن کر جواب دیا کہ میں آپ کا تابعدار
ہوں جلد اس داستان کو نظم کر دوں گا اگر یہ قصہ عمدہ نظم ہو گیا اور پادشاہ نے پسند فرمالیا
زمانہ نے مساعدت کی اور شاہ میری خدمتگزاری سے خوشنود ہو گیا تو شاید اس بہانہ سے
میری قدر ومنزلت میں اضافہ ہو جائے جس کی وجہ سے میری تشویش وافکار دور ہو جائیں اگرچہ میں
اپنی نادانی کا اقرار کرتا ہوں لیکن خدا کی رحمت اگر شامل حال ہے پادشاہ کا پرتو مجھ پر پڑے گا جس سے مجھکو
از حد مسرت اور سرخروئی ہوگی میں اپنی لیاقت کے بموجب اس کام میں کوشش کروں گا اور اپنی نوبت کے موافق نظم کر دوں گا“

اس بیان سے شبلی کے قول کی تردید ہونے کے علاوہ یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں ہم فردوسی سے
دوچار نہیں ہیں بلکہ کسی اور شاعر سے جو فردوسی سے مختلف ہے اور جس کی شاعری کی شہرت بھی عام طور پر نامعلوم ہے
وزیر عراق سے اس کی تقریب کرانے کے لئے امام موفق اس کو زلیخا لکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ شاعر اس قدر گمنام
ہے کہ وزیر کے دربار تک خود نہیں جا سکتا۔ اس کی مثنوی امام موفق کے وساطت سے اس تک جائے گی۔ جب
امتحاناً تھوڑا سا مثنوی سے وزیر سن لیگا اور پسند کرے گا تب کہیں غریب شاعر کی قسمت چیتے گی۔ اگر یہ شخص واقعی
فردوسی ہے تو اہوازیوں کی اس حماقت کا جواب شاید تاریخ میں کہیں نہ مل سکے کہ شاہنامہ کے ساٹھ ہزار اشعار پڑھنے
کے بعد بھی ان کو فن شعر میں فردوسی طوسی خدائے سخن کا پایہ معلوم نہیں ہوا اس لئے اس کا امتحان لیا جاتا ہے
اس کو بختیاری جیسے گمنام شاعر کے مقابلہ میں کھڑا کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں اگر قدردانی کی امید رکھتے ہو
تو اس کی مثنوی کا جواب لکھو لیکن خدارا اس طرح لکھنا کہ دوسرے شاعر انگشت نمائی نہ کریں۔

مرا گفت خواهم که اکنوں تو نیز | بباشی بگفتار و شغلی به نیز
هم از بهر ایں قصۂ ساز آوری | ز هر گوشه معنی فراز آوری
سخن را بدانش مرکّب کنی | ز شیب و عوارش مهذّب کنی
بگوئی چناں کاں دگر شاعراں | نیابند زحف و تعدّی دراں
اگر باشدش نظم و ترکیب نغز | معانی پسندیده و هوش و مغز
سخنگاه دلگیر هر جایگاه | قوافیش چوں نائے بر پایگاه
نه ناقص نه غامض نه یازیده سست | حسین و لطیف و روان و درست
برم نزد دستور میر عراق | که گرد انش خیلند و ایران وثاق
بدان تا گرش رائے باشد یکے | بخوانند نزدیک او اندکے
بداند ترا آں سپهر سپاه | که چوں داری اندر سخن دستگاه
ازو مر ترا ایں کفایت بود | که ایں مایه بهتر عنایت بود

امام اجل کی اس ہدایت پر جو ایک مبتدی شاعر کے لئے زیادہ موزوں ہوسکتی ہی فردوسی برا ماننے کے بجائے اُلٹا فخر کرتا ہے اور خوشامد کے لہجہ میں کہتا ہی ؎

چو بشنیدم ایں گفتگوئے اجل | دلم را شد اکثر اُمید اقل
چنیں گفتمش کائے جہانِ کرم | بجود و نوال و نهاد و نعم
خرد را مدار و سخن را سوار | پناهِ جہاں ز آفتِ روزگار
تن و جان من زیرِ فرمانِ تست | رواں در تنِ من ثناخوان تست
بود آں زماں حشمتِ من رہی | که بر من بدیں کار فرماں دہی
بخواہی ز من بندۂ مہرباں | یکے آفریں با یکے داستاں
بامر تو اے در جہاں بے نظیر | بگویم من ایں قصۂ دل پذیر
اگر طبع نیکو بپیوندش | اگر شاه فرزانه بپسندش

نگر دست گیرد مرا روزگار	شود شاد ازیں خدمتم شہریار
مگر من رہی یا بم از فرشاہ	بیابم زحشمت یکے پائگاہ
زدل فکرتم پاک بیروں شود	بہ پیراں سرم حشمت افزوں شود
اگرچند دربند نادانیم	بدارد مگر ایزد ارزانیم
رساند برحمت مرا پایۂ	فتد برسر از خسروم سایۂ
ازیں سایہ من بندۂ مدح گوئے	شوم شادمان و بوم سرخروئے
بکوشم باندازۂ دستگاہ	کنم برفزود سخن راں نگاہ

ان اشعار نے مجھکو اپنے قدیم عقیدہ میں اور راسخ کردیا ہی کہ اس تصنیف کو فردوسی سے کوئی نسبت نہیں ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کہاں فردوسی اور کہاں یہ غریب شاعر لیکن ہم نے بدقسمتی سے شبہ کو گوہر اور ذرہ کو آفتاب مان لیا ہی۔ ان اشعار میں لفظ "اجل" دو موقعوں پر استعمال ہوا ہی اور بحیثیت لقب یاد کیا گیا ہی مجھکو جہاں تک معلوم ہی فردوسی کے بعد تک اس لقب کا رواج نہیں ہوا ان ایّام میں اس کے بجائے لفظ جلیل کا رواج تھا اور وزرا و اُمرا کے لئے آتا تھا۔ خاندان بویہ کے بعض وزرا کے لقب میں اُستاد جلیل شامل تھا۔ عضد الدولہ وزیر نوح بن منصور کو "الشیخ الجلیل السید ابی الحسین عبید اللہ بن احمد العتبی" اور تاش حاجب کو "الحاجب الجلیل ابی العباس تاش" خطوں میں لکھتا تھا سلطان مسعود نے اپنے بھائی امیر محمد کو خط میں "الامیر الجلیل الاخ" لکھا تھا سلجوقیوں نے اپنے کارناموں کی ابتدا میں معز سوری کو یہ القاب لکھا تھا "اے حضرت الشیخ الرئیس الجلیل السید مولانا ابی الفضل سوری المعز" (بیہقی صفحہ ۵۸۳) احمد بن عبد الصمد وزیر دوم سلطان مسعود ابو نصر مشکانی کا القاب یہ لکھا کرتا تھا "الشیخ الجلیل السید ابی نصر بن مشکان" (بیہقی صفحہ ۴۶۱) فرخی امیر یوسف بن ناصر الدین کا نام یوں ذکر کرتا ہی میر جلیل سید ابو یعقوب یوسف برادر ملک ایران اور خواجہ احمد میمندی کے فرزند کا ذکر اس طرح کرتا ہی۔ وزیرزادہ سلطان و برکشیدہ اُو بزرگ ہمت ابو الفتح سرفراز تبار جلیل عبد رزاق احمد آں کہ فضل و ہنر بدو گرفتہ یمین و بدو گرفتہ یسار منوچہری ایں ہنر خواجہ جلیل چو دریاست با ہنر بیشمار گوہر بحد یمینی میں سلطان محمود کے وزیر کا نام

یوں درج ہے "شیخ الجلیل شمس الکفاۃ ابا القاسم احمد بن حسن المیمندی" تفریحاً کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ اس لقب کو رواج نہیں دے سکتا تھا بیہقی میں ایک فقرہ آتا ہے "و امیر محمود روزی مرا گفت چرا لقب تو جلیل کردہ اند و تو بہ جلیلی (صفحہ ۴۰۸) جلیل کا قایم مقام اجل ہے ابتدا میں خالی "اجل" ملتا ہے بعد میں ترکیب پاکر "صدر اجل" "امیر اجل" "شیخ اجل" "امام اجل" بنجاتا ہے" بہرحال اس لقب کا رواج سلجوقی دور میں ہوتا ہے پانچویں صدی میں زیادہ تر امرا کے لئے مخصوص ہے چھٹی صدی میں وزرا اور علما کے نام کے ساتھ بھی رائج ہو جاتا ہے اور اکثر ملتا ہے ناصر خسرو ؎

بسے دیدم اعزاز و اجلالہا ‌ ‌ ‌ ‌ زخواجہ جلیل و امیر اجل

ولیکن ندارد مرا ہیچ سود ‌ ‌ ‌ ‌ امیرِ اجل چوں بیاید اجل

ولہ ‌ ‌ روا بود کہ امیرِ اجل تو پشت کنی ‌ ‌ ‌ ‌ اگر امیر اجل از تو باز دارد اجل

حدیقہ میں حکیم سنائی بہرام شاہ غزنوی کے وزیر کا نام یوں ذکر کرتے ہیں "الصاحب الاجل العالم صدر الدین نظام الملک ابی محمد الحسن قاینی" اور نائب وزیر کا نام "الاجل نظام الدین تاج الخواص ابی نصر محمد بن محمد المستوفی" انوری ؎

امیرِ اجل فخرِ دیں بو المفاخر ‌ ‌ ‌ ‌ امیری بصورت امیرے بمعنی

ولہ ‌ ‌ صدرِ عالی اجل جمال الدین ‌ ‌ ‌ ‌ کہ چو دستِ تو ابر جیحوں نہ

ولہ ‌ ‌ اگر برنج ندارد اجل نجیب الدین ‌ ‌ ‌ ‌ کہ ہیچ رنج مبادش ز عالمِ بدکیش

علامہ شبلی فردوسی کی عشقیہ شاعری کی مثالیں بیان کرتے وقت فرماتے ہیں :-

"سہراب اب سپہگری چھوڑ کر عشق کا دم بھرنے لگا۔ دیکھو فردوسی اس کی نالہ و زاری کو کس طرح ادا کرتا ہے ؎

ہمی گفت ازاں پس دریغا دریغ ‌ ‌ ‌ ‌ کہ شد ماہِ تابندہ در زیرِ میغ

غریب آہوئے آمدم در کمند ‌ ‌ ‌ ‌ کہ از بند جست و مرا کرد بند

زہی چشم بندی کہ آں پرفسوں ‌ ‌ ‌ ‌ بہ تیغم نخست و مرا ریخت خوں

نداٰنم چہ کرد آں فسوں گر بمن | کہ ناگہ مرا بست راہ سخن
به زاری مرا خود بباید گریست | کہ دلدار خود را ندانم کہ کیست
ہمی گفت و می سوخت از غم بسے | نمیخواست رازش بداند کسے
و لے عشق پنہاں نماند کہ راز | بمردم نماید ہمی اشک باز
غم جاں برآرد خروش از دروں | اگرچند عاشق بود ذو فنوں

ان شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہی شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں ع کہ از بند جست و مرا کرد بند ۔

ع   بہ تیغم نخست و مرا ریخت خوں

یہ سب کچھ ہی لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ سہراب کی داستان لکھ رہا ہی محمد شاہ واجد علی شاہ کی نہیں اس لئے فوراً سہراب کو ہومان کی زبان سے نصیحت کرتا ہے اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح کی نصیحت کا کیا انداز ہی ؎

ازاں کار ہوماں نبودش خبر | کہ سہراب راہست خوں در جگر
ولے از فراست بدل نقش بست | کہ او را پریشانئی داد دست
بدام کسے پائے بند آمدہ ست | ز زلفے بتی در کمند آمدہ ست
نہاں میکند درد و خونیں ولست | ہوس میرود راہ و پا در گلست
یکے فرصتے جست و گفتش براز | کہ اے شیر دل گرد گردن فراز
فریب پری پیکران جواں | نخواہد کسے کو بود پہلواں
نہ رسم جہانگیری و سروری ست | کہ از مہر ماہی بباید گریست
ز توراں بکارے بروں آمدیم | شناور بدریائے خوں آمدیم
اگرچند ایں کار باشد بکام | ولے ہست در پیش رنجے تمام
بباید شہنشاہ کاؤس و طوس | چو رستم کہ بر شیر دارد فسوس

پھر بہت سے ایرانی پہلوانوں کے نام گنا کر کہتا ہے ؎

توئی مرد میدان این سروران | چہ کارت بہ عشقِ پری پیکران
تو کاری کہ داری نبردی بسر | چرا دست بازی بکارِ دگر
بہ نیر دی مردی جہاں را بگیر | زشاہاں بدست آر تاج و سریر
چو کشور بدستِ تو آید فراز | بہر جائے خوباں بر ندت نماز
ازاں گفتہ سہراب بیدار شد | دلش بستۂ بند پیکار شد
بگفت اے سزا مدارانِ چیں | بگفتار خوبیت ہزار آفریں
شد ایں گفت تو داروی جانِ من | کنوں با تو نو گشت پیمانِ من
جہاں را سراسر چہ خشک و چہ آب | در آرم بفرمانِ افراسیاب
بگفت این و دل راز دلبر بکند | بر آمد برا فراز تختِ بلند

یہ تمام اشعار الحاقی ہیں فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور بعد میں کسی نے اضافہ کر دیئے ہیں یہ اصل میں چھپّن اشعار کا ایک قطعہ ہے جو ؎

ہمی جست گرد آفرید و ندید | دلش مہر پیوند او بر گزید | سے شروع ہو کر
ازاں شاد شد شاہ توراں زمیں | ہمی کرد سہراب را آفریں

پر ختم ہوتا ہے اور ان اشعار کے درمیان واقع ہے ؎

بفرماں ہمہ پیش او آمدند | بجاں ہر کسے چارہ جو آمدند | (سطر ۳۲ صفحہ ۸۹)
ازاں پس چو نامہ بخسرو رسید | غمی شد و لش کاں سخنہا شنید

(جلد اوّل صفحہ ۹۰ سطر پندرہ بمبئی ۱۲۷۵ھ)

اِن اشعار کی تلاش میں میں نے شاہنامہ کے کئی معتبر اور قدیمی نسخے دیکھے لیکن ان میں یہ اشعار نظر نہیں آئے علاوہ بریں ٹرنر میکن جس نے سب سے پہلی مرتبہ شاہنامہ چھاپ کر شائع کیا ہے وہ بھی ان اشعار کو الحاقی مانتا ہے۔

اردو زبان کی ترقی میں صوبۂ بہار کا حصہ

از

(جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی)

مگدھ و متھیلا یا صوبۂ بہار ابتداء عہد ترقی بنی نوع انسان سے ایک اہم ترین حصۂ زمین رہا ہے۔ آغاز تاریخ کے وقت بھی اس کا آفتاب تہذیب و تمدن بام فلک تک پہنچنے کے لئے کئی سیڑھیاں طے کر چکا تھا، اور اس وقت جب کہ تمام عالم ایک ظلمت کدۂ گمراہی و بربریت بنا ہوا تھا، یہ بزم شمع تہذیب سے منور تھی بڑے بڑے پنڈت جید عالم سنسکرت، فیلسوف، موجد، فقیہ، ادیب، مدبر اور سورما اس مجلس کی زیب و زینت بڑھا رہے تھے آریوں کا مایۂ فخر کوئی گوشۂ ہند تھا تو صرف یہی ارضِ مقدس تھی۔ بہار کا بڑا کتب خانہ، نالندہ کا دارالعلوم اسوک و چندر گپتا کا دارالسلطنت، مہاتما بدھ کا مولد، مقام عبادت (تپسیا) سیاحانِ یونان و چین کا مرکز اور مذہب بودھ کا عظیم ترین معبد سب کے سب اسی پاک قطعۂ ارض میں جمع ہیں۔ گنگا جیسا بڑا دریا اسی کے گودوں میں جوان ہو کر دوسرے صوبوں کو فیضیاب و سیراب کرتا ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی کرو تو تم کو نظر آئے گا کہ یہ صوبہ ابتدا سے اس وقت تک ہمیشہ اہم ترین صوبہ رہا ہے۔ ہندوؤں کا ہلالِ عروج یہیں بدر بنا، برہمنوں نے پھر اسی ملک میں زور پکڑا، بودھ مذہب کی اشاعت و تبلیغ کا یہی صدر مقام تھا، فاہیان اور ہیونتسانگ کے سفر نامے پڑھو تمھیں اپنی گزشتہ تہذیب و ترقی کے گم شدہ دھندلے نشانات ملیں گے، اور اس میں بھی محبت و آشتی، شوق علم و ذوقِ تحقیق کے مختلف مناظر پیش نظر ہونگے اور تم اس کے مطالعہ کے بعد بے ساختہ کہہ اٹھوگے:۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم　　　از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

حضرت سیّد اولاد حیدر شوق نے جو اس وقت صوبہ کے ایک مایۂ ناز بزرگ ہیں اپنی تاریخ بہار میں اس عہدِ زرّیں کو یوں لکھا ہے:۔

"صوبۂ بہار تاریخی عظمت اور وقعت کے اعتبار سے ممالک ہندوستان کے اور دوسرے صوبوں سے مقابلہ اور موازنہ میں کم نہیں کہا جا سکتا۔ یہ دعویٰ صوبۂ بہار کی تاریخ لکھنے کی خصوصیت سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اہل تاریخ اس کی قدامت، اس کی شہرت، اس کی زرخیزی، اس کی قدیم حکومت، اور اس کی تہذیب و معاشرت کو تاریخ ہندوستان کا ایک ضروری اور دلچسپ حصّہ قرار دیتے ہیں"

عہدِ اسلامی کو دیکھو اس وقت بھی یہ صوبہ کسی صورت میں کسی صوبہ سے پیچھے نہیں رہا۔ اس عہدِ زرّیں میں بھی سہسرام، عظیم آباد، بہار، مولانگر، شاہ آباد وغیرہ میں بڑے بڑے مدارس اسلامی قائم تھے۔ یہ بہار ہی تھا جس نے محب اللہ جیسا منطقی و فلسفی، بیدل سا شاعر، مولانا عبدالحمید صاحب جیسا ادیب، مولوی یعقوب صاحب دسنوی جیسا ماہر علم نجوم، مولوی سخاوت علی جیسا مجمع العلوم پیدا کیا۔ اور اگر پٹھانوں کے چراغِ کشتہ کو کسی نے پھر روشن کیا۔ تو وہ بہار کا پٹھان شیر شاہ تھا۔ المختصر اس عہد میں بھی بہار ترقی کے اعلیٰ ترین درجے پر تھا۔ حتیٰ کہ ہندوؤں میں بڑے بڑے ماہر علوم فارسی و عربی مصنف پیدا ہوئے، جن کی کتابیں آج بھی اُن فنون کے لئے باعثِ فخر و ناز ہیں، اور علم تاریخ و موسیقی میں تو وہ مسلم الثبوت ہیں۔

اس عہد کے بعد ایک دَورِ جدید شروع ہوتا ہے اور ہندوستان ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ اُس وقت بھی یہ صوبہ ہر حیثیت سے ہر راہ حیات میں اچھی طرح گامزن تھا۔ اور اب جب کہ اس صوبہ کا نواں سال ہے بہار پھر اپنی گزشتہ حالت کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس طرح سانپ کینچلی سے نکل کر ایک بار پھر اپنی پوری شان و شوکت، تیزی و چستی حاصل کر لیتا ہے اسی طرح یہ پھر مدارج ترقی کو تیزی سے طے کر رہا ہے اور خداوندپاک سے اُمید ہے کہ نہ سالہ طفل بہت جلد سن شعور کو پہنچکر اپنی مادر وطن کا ایک لائق و رشید فرزند ثابت ہوگا۔ آمین!

یہ تمہید صرف اس لئے لکھی گئی کہ صوبۂ بہار کا درجہ و رتبہ سیاسی حیثیت سے اور از روئے تہذیب و تمدن

معلوم ہو جائے۔ اور یہ بات بدیہی ہے کہ جہاں تہذیب و تمدن کے پھول ہونگے وہاں علوم و ایجادات کے پھل پیدا ہونگے۔ اور یہی سبب ہے کہ یہاں زبان بھی اسی قدر ترقی یافتہ تھی جتنی یہاں کے لوگ اور اس میں بھی اتنی ترقی ہوئی کہ سلطنت کی طرح تمام ملک پر مسلّط ہوگئی۔ یوں تو یہاں کے قدیم اصلی باشندوں کی زبانوں کی تاریخ کا پتا نہیں چلتا، لیکن اس پر بھی وہ سب ایک چشمے کی دو دو الیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جب آریوں نے اس ملک پر تسلّط کیا ان کی زبان سنسکرت تھی۔

یہ فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی ہر ہر بات سے رعونت و تکبّر اور ادّعاءِ افضلیت ٹپکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زبان کا نام "دیوبانی" یا زبان الٰہی رکھا اور اس کی عظمت یہاں تک بڑھادی کہ مقدس بزرگوں کے سوا کوئی اُسے پڑھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور بیچارے شُدر تو سُن بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن آخر یہ نشہ کب تک رہتا۔ دریا میں غوطہ زنی کرنا اور یہ خیال کرنا کہ دامن تر نہ ہو محال ہے۔ کیوں کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر۔ ایک ملک میں رہنا، ایک زمین پر بسنا، آپس کی خرید و فروخت لین دین، غرض کہ قدم قدم پر واسطہ پھر یہ احتیاط رہتی تو کب تک اور یہ چھوت باقی رہتی تو تا کے؟ رفتہ رفتہ وہاں کی عام زبان میں سنسکرت کے الفاظ ملنا شروع ہوگئے۔ اور پراکرت (عام زبان) نے وسعت حاصل کی۔

راجہ بھوج کے زمانہ کی ناٹک (ڈرامے) کی کتابیں دیکھئے تو اس سے صاف پتا چلے گا کہ خاص خاص لوگ سنسکرت بولتے ہیں۔ اور عام لوگ پراکرت ہی میں گفتگو کرتے ہیں۔ پراکرت اپنے الفاظ کی وجہ سے سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن منو سمرتی تک سنسکرت میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔[۱]

بہار کا یہی حال تھا کہ ہندوستان میں ایک انقلاب عظیم کے آثار نمودار ہوئے۔ برہمنوں کے تشدد، خود رائی، و خود غرضی، و حرص نے تمام صوبہ کے لوگوں کو تباہ و برباد، خستہ و خراب، کر رکھا تھا۔ اور اندر اندر ہی ایک آگ ان غاصب برہمنوں کے خلاف سلگ رہی تھی کہ مذہب بدھ کے بانی شاک منی

---

[۱] آب حیات آزاد مرحوم

پیدا ہوئے۔ درفش کاویانی نے جو کچھ ضحاک کے ساتھ کیا تھا وہی اُن کی تبلیغ نے کیا۔ برہمنوں کے ارادوں کا شیرازہ بکھر گیا، ان کی قوت ٹوٹ گئی، اور اس دعوت عمومی نے تمام معاشرتی قیود کی کڑیاں ایک ایک کرکے اس سرعت سے توڑ دیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ آجاتا سترو نے اس مذہب کو قبول کیا اور اشوک نے اُن کی پشت پناہی کی۔ اور یہ تمام اطراف عالم میں پھیل گیا۔ اس دعوت عام کے لئے زبان بھی عام درکار تھی۔ مہاتما بدھ خود "مگدھی" زبان بولتے تھے اور لوگ یہی زبان سمجھتے تھے اس لئے یہ زبان بھی ملک کے اس سرے سے دوسرے تک پھیل گئی۔ اس زبان کی ترقی کے بارے میں "صاحب آب حیات" لکھتے ہیں:-

"مگدھ دیش کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہوگئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم وفنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہوکر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے۔ اور فنون کے کارخانے جاری ہوگئے۔"

دنیا کا دستور ہے کہ ہلال بدر ہوتا ہے اور بدر ہلال۔ ہر کمالے را زوال۔ آخر اس مگدھی پراکت کے بھی ایام جوانی گزر گئے۔ اور ۱۵ سو برس کے بعد پھر شنکر اچارج کے قدموں کی برکت سے سنسکرت کے دن پلٹے۔ اور اس چراغ نے سنبھالا لیا۔ اس کی روشنی بڑھی اور راجہ بکرماجیت کے عہد میں تو اتنی تیز ہوئی کہ آج تک آنکھیں خیرہ ہیں۔ لیکن برہمنوں کی ان تھک کوششوں کے باوجود پراکرت مٹ نہ سکی۔ صرف امرا اور پنڈت سنسکرت بولتے تھے۔ ملک الشعرا مایۂ ناز مادر وطن بابا کالی داس کا مشہور ڈراما شکنتلا پڑھو۔ اس سے اس عہد کی زبان کا پورا پورا حال تم پر کھل جائے گا۔ اور پتا چل جائے گا کہ سنسکرت کی کہاں تک وسعت تھی۔ اور ہماری بہاری مگدھی زبان کا سکہ کہاں کہاں چلتا تھا۔ اور اُس وقت بھی پالی زبان کے سر پر قبولیت کا تاج تھا۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ بہار میں پالی، برج میں برج بھاشا کی پریاں دربار میں اپنی سج دھج دکھانے کو آئیں۔ اور یہی زبان آگے چل کر طفل اُردو کی مادر مہربان ثابت ہوئی۔

برج بھاشا کا خالص راج راجہ بھرت کے زمانہ ۱۰۰۰ء تک رہا۔ لیکن محمود غزنوی کے حملوں نے

زبان کے خزانہ پر بھی تاخت و تاراج شروع کر دی۔ اور اس کے بعد سے بعض الفاظ کا ملنا جلنا شروع ہو گیا اور ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری کی فتح کے وقت تو بہت سے الفاظ نہ صرف زبانوں پر رائج تھے، بلکہ مصنف اپنی کتابوں میں لکھتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے مشہور شاعر چند کوی نے جب اس جنگ کا حال لکھا تو اس میں اکثر عربی و فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

پروردگار	परवरदीगार	محل	महल
کریم	करीम	پیغام	पैग़ाम
سلطان	सुलतान	سرطان	सरतान
پادشاہ	पादशाह	مسلمان	मुसलमान
دیوان	दीवान	فرمان	फ़रमान
ملک	मलीक	حوت	हूत
خلق	खलक	سلام	सलाम

دنیا کی تمام زبانوں کا قاعدہ ہے کہ ان میں بعض بعض خاص ایسے الفاظ ہوتے ہیں کہ اگر دوسری زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا جائے تو سطروں میں ہوتا ہے اور پھر بھی اس کے وسیع معنی کا دائرہ بند نہیں ہوتا مثال کے طور پر انگریزی کے دو لفظ کیرکٹر Character اور سیولیزیشن Civilisation کو لے لیجئے۔ کیا اُردو میں کوئی لفظ اس قدر وسیع معنی کا مل سکتا ہے؟ اور گو اول الذکر کا ترجمہ اخلاق اور دوسرے کا تمدن و تہذیب ہوا ہے۔ لیکن وہ معنی ان اُردو کے الفاظ میں نہیں۔ اس لئے اختصار کے لئے ہمیں دوسری زبان کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ (۲) وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر چیزیں نئی ہوتی ہیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں (۳) سفر میں جب دو شخص ساتھ ہوں اور دو مختلف زبان والے ساتھ ہوں تو ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھانے کے لئے حتی الامکان مخاطب کی زبان کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ (۴) "الناسُ علی دینِ ملوکہم" جس زبان والے کی حکومت ہوتی ہے اُس کی زبان کی بھی حکومت ہوتی ہے۔ فاتح قوم کی ہر ہر ادا و حرکت، لباس، طرز معاشرت، طریقۂ ملاقات، دستورِ زندگی

زبان تمام چیزیں مفتوح قوموں میں حلول کر جاتی ہیں۔ آج کون سا ایسا جاہل سے جاہل شخص ہی جو ریل ٹکٹ اسٹیشن، پوسٹ آفس، لالٹین، پنسل، اسٹامپ، جج، کلکٹر وغیرہ کے الفاظ نہایت اطمینان سے استعمال نہیں کر سکتا ؟ (۵) اور سب سے بڑی چیز یہ ہی کہ آپس کے رہنے سہنے، میل وجول، آمد و رفت، آشتی و محبت دوستی و الفت، رسم و راہ، لین دین، خرید و فروخت، کاروبار و معاملہ سے مجبوراً ایک دوسرے کے الفاظ بولنے پڑتے ہیں۔ اور جب مسلمانوں نے حکمراں قوم کی حیثیت سے اس ملک پر قبضہ کیا اور بود و باش اختیار کر لی اور ہندو و مسلمانوں کا چولی دامن، گوشت اور ناخن کا ساتھ ہوگیا تو پھر زبانیں دو کیوں رہتیں۔ ادھر دو اجنبی قوموں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور اُدھر بھاشا نے زبان فارسی کے چیدہ چیدہ الفاظ کو اپنے یہاں جگہ دی۔ گو زمانۂ دراز تک دربار کی اور دفتر کی زبان فارسی نہ تھی لیکن ہمارے کالیستھ بھائیوں نے سکندر لودی ہی کے زمانہ سے فارسی پڑھکر دفتروں میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ہمارے صوبے میں بھی فارسی کے شاعر، مورخ اور مصنف پیدا ہوئے جن کو موضوع کے باہر ہونے کی وجہ سے نظر انداز کیا جاتا ہی۔

یوں تو کہا جاتا ہی کہ اُردو کی ابتدا شاہجہان کے زمانے سے ہوئی اور اُس وقت سے ترقی کرتی ہوئی یہ زبان اس درجہ تک پہنچی ہی جیسا کہ آزاد صاحب لکھتے ہیں :-

"ایک بچہ شاہجہانی بازار میں پھرتا ہی شعرا اُسے اٹھالیں اور ملک سخن میں پال کر پرورش کریں انجام کو یہاں تک نوبت پہنچے کہ وہی ملک کی تصنیف و تالیف میں قابض ہو جائے۔"

اور میر امن دہلوی مولف باغ و بہار اس کی ابتدا اکبر اعظم کے زمانے سے بتاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکھٹے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب

کرتے۔ ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔"

لیکن واقعات اور دوسرے قرائن سے پتا چلتا ہے کہ اس موجودہ اُردو کی ابتدا شاہجہاں کے وقت سے ہوئی۔ چنانچہ صوبۂ بہار کے مایۂ ناز و باعثِ فخر محترم قوم جناب حضرت شاؔد جنھوں نے زبان اُردو کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے جو آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ تحریر فرماتے ہیں:-

"سولھویں صدی عیسوی شاہجہانی عہد میں اُس نے اپنی سرسبز شاخوں اور گھنیری چھانوں سے لوگوں کو اپنا سہانا رنگ و روپ دکھایا۔"

جناب راقم الدولہ مولانا سید ظہیر الدین حسین صاحب ظہیر دہلوی یادگار حضرت خاقانیِ ہند (ذوق) کی بھی یہی رائے ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"بادشاہ شاہجہان نے حصار کھینچکر شاہجہان آباد کو آباد فرمایا۔ اور جامع مسجد اور لال قلعہ تعمیر کر کے قلعہ معلیٰ میں جلوس فرما کر دار الخلافہ ٹھہرایا۔ اور بیرون قلعہ اہل لشکر کی سکونت کے لئے حکم دیا۔ اور بازار آباد کیا وہ بازار اُردو بازار کے نام سے موسوم ہوا..."

"اُس بازار کے باشندے چونکہ اہلِ لشکر تھے اور مختلف اللسان، اور اب آکر باہم اتفاق زبان ہوا تو اس کا نام اُردو معلیٰ قرار دیا۔"

لیکن ہمیں یہ بات پوری طور سے یاد رکھنی چاہیئے کہ گو اُردو کے اس عہدِ جدید نے جو شاہجہان کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور اب تک قائم ہے کئی مختلف دور دیکھے ہیں اور کتنے ہی حوضوں سے غوطہ کھا کر نکلی ہے۔ اور ہر مرتبہ ایک نئے رنگ میں۔ لیکن اس کی ابتدا خلجیوں ہی کے زمانے سے ہوئی تھی چنانچہ جناب جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر اپنی سب سے پہلی تصنیف "آثار الصنادید" مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں تحریر فرماتے ہیں:-

"امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں ہی کے زمانے سے یعنی حضرت مسیح سے تیرھویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کئے تھے۔ اور کچھ پہیلیاں اور مکرنیاں اور نسبتیں ایسی زبان میں کہیں تھیں جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔ غالب ہے کہ رفتہ رفتہ

۳۸۷۲

بھاشا میں جب ہی ملاپ شروع ہوا ہو"

حضرت خسرو جن کو اُردو زبان کا باوا آدم کہنا بے جا نہ ہوگا۔ خالق باری مختلف پہیلیوں، مکرنیوں، گیت اور "غزل مشترک" کے مصنف ہیں۔ ان کے بعد بھاشا کی مملکت پر فارسی و عربی نے اس آہستگی سے دخل کرنا شروع کیا کہ تین سو برس بعد بھاشا کے پاس ایک چپہ پر بھی ملک سخن باقی نہ رہا۔ اور بیچاری کتابوں کے غار میں ورقوں کی چادر سے منھ لپیٹ کر پڑ رہی۔ اور آج بھی اس ہنگامۂ آتش خیز کے بعد اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنے حجرہ سے باہر آ کر لوگوں کو درشن دے سکے۔ اور بیگم اُردو کا سکّہ ادھر اٹک سے کٹک تک اور ادھر کشمیر و ہمالیہ سے راس کماری تک چل رہا ہے۔ جہاں جائیے اسی کا خطبہ ہے اور جس بزم میں پہنچئے اسی کی مدح سرائی ہے۔ اُس نے درجہ بدرجہ بہت ہی اصول کے اندر پابند ہو کر ترقی کی ہے۔ اور اس وقت تمام ہندوستان کی واحد عام علمی اور مشترک زبان ہے۔ اللہ اس کو ہمیشہ قائم رکھے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہاں تک تو زبان اُردو کے ابتدا کی عام تاریخ تھی۔ لیکن ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے صوبے نے اپنی اس پیاری کی کیا خدمت کی اور اس کی ترقی میں کیا کوششیں کیں۔ اس لئے ہم صرف اپنے صوبے کی زبان پر ایک سرسری تاریخی نظر ڈالنی چاہیئے۔

ہم جیسا آگے بتا چکے ہیں کہ یہاں کی اصلی زبان پالی یا مگدھی پراکت تھی اس کے بعد آندر نبسی راج میں برج بھاشا یہاں بھی پہنچی اور اس کے بڑے بڑے شاعر اور ماہر یہاں پیدا ہوئے۔ چنانچہ حکیم آریہ بھٹ چارکا پنڈت موجد علم طب، اور دہشتر پنڈت اسی خاک سے اُٹھے تھے۔ اور شاعروں کی مشق سخن سے بھاشا بالکل منجھ گئی تھی۔ چنانچہ ۱۱ھ صدی تک اس کی شاعری بالکل خالص تھی۔ ملاحظہ ہو۔

پرسوں آون کہہ گئے کہ برسوں نہ آیو پیو   جو پرسوں آویں نہیں تو پرسوں آتن جیو

اس قسم کی شاعری کے یہاں کی خاص چیز چیت ہوتی ہے۔ اس مہینے میں بچہ بچّہ کسی نہ کسی شاعر کا چیت الاپتا پھرتا ہے اور ہر سال سیکڑوں گیت گائے جاتے ہیں۔ گو نہ اب وہ عظیم آباد ہے اور نہ وہ اس کے

زندہ دل باشندے لیکن اس پر بھی شہر میں دو چار دن تک ایک نئی زندگی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے دیکھنے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ کس طرح عربی و فارسی کے الفاظ بھاشا میں داخل ہوئے۔ قبل عہد اسلامی کا ایک چیت ہے[۱]

دیکھہوں نہیں بولی ہو راما نینا بھری رے　　ساںجھ کے بوتل پیوا وگلی کرنیاں ہو راما

نینا بھری رے ۔ الخ

لیکن جب بختیار خلجی نے بہار و بنگال پر ۱۱۹۷ء میں حملہ کیا اور اس کا الحاق دہلی کی حکومت سے ہو گیا اسی وقت سے الفاظ عربی و فارسی کا دخل بھی شروع ہو گیا۔ چنانچہ دوسرے چیت سے پتا لگتا ہے۔ ملاحظہ ہو

چلو سکھیو رے مالی کے بگیا[۲] ہو راما　　بیلا پھولے چنپا پھولے

پھولے لاگلبوا[۳] ہو راما　　چلو سکھیو رے

اس وقت سے بھاشا میں عربی و فارسی کے الفاظ شامل ہونا شروع ہو گئے۔ بابا کبیر کی تبلیغ نے زبان پر بہت بڑا اثر کیا اور ان کے دوہے سنو تو اس میں اکثر فارسی و عربی کے الفاظ نظر آئیں گے! اور یہ بزرگ بہاری کے تھے۔ لیکن اس وقت تک اردو نے کوئی مستقل صورت اختیار نہیں کی تھی البتہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں عہد شاہجہان سے اس نے جنم لیا اور مستقل زبان کی سند دربار خرمی سے ملی۔ اس بادشاہ کے منہ موڑنے کے بعد ہی لوگوں کی طبیعت نے زور لگایا اور اردو شاعری کا موجد و بانی شمس ولی اللہ کا غلغلہ دکن سے بلند ہوا۔ اُس وقت ہر جگہ سناٹا تھا لیکن اس وقت بھی اگر کوئی شاعر اس کا ہم عصر تھا تو وہ عبدالقادر بیدل عظیم آبادی تھا اور اس نظم اردو میں اس کا کوئی ہمسر تھا تو وہ خاک بہار کا یہی یتیم نوجوان تھا۔ لکھنؤ و دلی والے اپنے کو زبان اردو کے مالک کہتے ہیں۔ لیکن کوئی پوچھے اس تیزی طبیعت نے اس وقت کیوں جوہر نہ دکھائے اور یہ شاعرانہ تگ و پو کہاں تھی لیکن جب بیدل و ولی نے راستہ بنا دیا تو

۱؎ یہ چیت اسلامی عہد سے قبل کا نہیں ہو سکتا۔ بوتل کا لفظ اسلامی عہد کے بہت بعد ہماری زبانوں میں داخل ہوا ہے۔ (اڈیٹر)

۲؎ باغ　۳؎ گلاب

پھر ہندوستان بھر کے شاعر اس راہ پر خیالی گھوڑے دوڑانے لگے۔ دنیا کا ہمیشہ سے یہی دستور چلا آیا ہے کہ جس جگہ سے کوئی اُمید ہوتی ہے کوئی کچھ نہیں کرتا۔ بلکہ ایک نامعلوم جگہ کا آدمی کھڑا ہوتا ہے اور سب کچھ کر جاتا ہے۔

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

اور لوگ محوِ حیرت ہو کر بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں۔

حسن ز بصرہ، بلال از حبش صہیب از شام زخاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبیست

مولانا بیدل کا اصل میدان فارسی ہے لیکن اُردو میں بھی وہ کسی ہم عصر سے کم نہیں ہیں اُن کی قابلیت و ادبیت کی شہرت بہت بڑھی ہوئی تھی حضرت غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:۔

"عمدۂ سخن طرازان و شہرۂ تحریر پردازان ست، در اقسام نظم پایۂ بلند و در اسالیب نثر رتبۂ ارجمند دارد۔ طبع درّاکش چہ قدر معانی بہم رسانده۔ و چہ ثمرہا نورس کہ از نہالِ قلم افشانده خلاصہ کلامش شراب میخانۂ ہوشیاراں۔ و طلاے دستمانۂ کامل عیاران ست از آغاز شعور تا دمِ آخر چشم بر سیمائے معنی دوختہ و چراغ عجبے بر مزار خود افروختہ"

ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ تمام رؤساء وقت ان کی ملاقات و ملازمت کو اپنا شرف سمجھتے تھے۔ اعظم شاہ نے ان کو اپنے یہاں رکھا تھا۔ نواب نظام الملک آصف جاہ ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ اپنے کو ان کا شاگرد بتاتے تھے۔ اور اُس پر اُن کو ناز تھا لیکن اُنھوں نے کبھی دنیا کے مال و دولت، شہرت و ناموری، جاہ جلال، عظمت و شوکت کی پرواہ تک نہ کی اور اُس وقت جب کہ اعظم شاہ نے اپنی مدح سرائی کے لئے فرمائش کی تو اُسی وقت اس کا دربار چھوڑ دیا اور پھر نہ گئے۔ نظام الملک نے جب اُنھیں بُلایا تو یہ شعر لکھ کر بھیجدیا۔

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

اس عہد میں اُردو کی ابتدا تھی اور اس میں اکثر الفاظ بھاشا ہی کے ہوتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت بیدل گردشِ روزگار سے چلنے لگے تو اپنی مُنہ بولی ماں کے ہاں جو ایک تیز اور حاضر جواب کٹنی تھی رخصت ہونے گئے تو کہا:۔

سر اُوپر جب کوئی نہیں تب دشمن آپن کیں پٹنہ نگری چھاڑ دیں اب بیدل چلے بدیس

کبڑن کو میرزا صاحب سے بہت محبت تھی آنکھوں میں آنسو بھرلائی اور بے ساختہ بول اُٹھی۔

سر پر یا یہ رام ہی بھن کا ہ بدے بے صبری　　بیدل بھی کرمت، چھاڑو پوتا آپن نگری[۱]

مصنف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں۔

"فارسی کلام آپ کا بڑے پایہ کا ہے۔ فارسی کے بڑے مشہور جلیل القدر شاعر اور اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ نازک خیال تھے اپنی ذہانتِ طبع اور نازک خیالی سے اختراع و ایجاد کے گُل بوٹے لگاتے تھے۔"

اُردو اشعار ان کے بہت کم دستیاب ہوئے۔ البتہ مصنف گلشنِ ہند اور منشی قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرہ مرتبہ ۱۸۸۱ء میں ان کے چند اشعار لکھے ہیں اُن میں سے دو یہ ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں　　اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا　　پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

مجھکو حضرت بیدل کی مختصر حیات لکھنے کی ضرورت صرف اس لئے ہوئی کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صوبہ بہار کا سب سے پہلا رہبر اُردو کس پایہ کا تھا۔ گیا ولی دکھنی کو بجز ٹوٹے پھوٹے اشعار کے اور بھی کچھ کرنا آیا[ع۵] اور اس میں بھی الفاظ کا دقیانوسی پن موجود لیکن حضرت بیدل کی زبان صاف، شستہ اور شیریں، خیالات بلند ہیں۔ ایک بیدل کیا بہار نے سیکڑوں شاعر ایسے پیدا کئے جو ملک کے لئے باعث فخر و ناز اور مایۂ افتخار بزرگ ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر گوشۂ ناواقفیت میں پڑے ہوئے ہیں۔ راسخ جیسا بلند پایہ شاعر جس کے ایک شعر پر میر جیسا تارک الدنیا شخص گھر سے باہر نکل کر اپنا مہمان بنائے، کہیں نہیں مل سکتا۔ لیکن آزاد صاحب نے بیچارے کے

---

[۱] نوائے وطن ۱۲

ع۵ قابل مضمون نگار کی یہ رائے بعید از انصاف ہے۔ بیدل کے صرف دو شعروں ہی سے یہ قیاس قائم کر لینا صحیح نہیں۔ ولی کے دیوان میں ایسے صاف شعر بیسیوں نکل آئیں گے۔ اگر بیدل کے کلام میں اُن کے زمانہ کی زبان نہیں پائی جاتی تو وہ بیدل کا کلام نہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ اُن سے منسوب کر دیا گیا ہے (اڈیٹر)

بارے میں بجز دو چار سطروں کے کچھ نہ لکھا اور اس پر اکتفا کیا کہ :-

"راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔ بہت سنجیدہ کلام ہے۔ پرانے مشاق تھے اور سب اُدھر کے لوگ اُنھیں اُستاد مانتے تھے۔ مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا نے کہا کوئی شعر سنائیے اُنھوں نے پڑھا :-

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے ۔۔۔ پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے

مرزا نے اُٹھکر گلے لگالیا۔"

مگر حضرت شاد عظیم آبادی اپنی کتاب نوائے وطن میں مولانا راسخ کا تلمذ میر صاحب سے بتاتے ہیں اور لکھا ہے کہ جب شیخ راسخ اُن سے ملنے گئے تو میر صاحب نے کہلا بھیجا کہ میاں کیوں ستانے کو آئے ہو؟ لیکن جب شیخ صاحب نے ٹھیکری پر یہ شعر :-

خاک ہوں پر طوطیا ہوں چشم مہر و ماہ کا ۔۔۔ آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا

لکھا، تو میر صاحب فوراً گھر سے نکل آئے۔ اور گلے سے لگا کر کہا کہ "بھئی مزاج مبارک کہاں سے آئے ہو اور کیوں مجھ غریب فقیر کو سرفراز کیا۔"

خود راسخ صاحب مرحوم نے اس طرف اپنی غزلوں میں اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

ہیں میر گزشتہ کے بدل حضرتِ راسخ ۔۔۔ اب ان کو سلامت رکھے اللہ تعالےٰ

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

راسخ کو ہے میر سے تلمذ ۔۔۔ یہ فیض ہے اُن کی تربیت کا

ایک مرتبہ نواب مہدی علی خاں مرحوم کے ہاں بڑی دھوم دھام کا مشاعرہ ہوا۔ مولانا نے صرف تین چار اشعار پڑھے۔ اس میں ذیل کا شعر دس مرتبہ پڑھا گیا۔

نہیں ہوش والوں سے کچھ حسد مجھے رشک ہے تو اُنھوں پہ ہے
جنھیں تیرے جلوہ کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

اللہ حضرت شاد کا بھلا کرے کہ اُنہی نے کچھ حالات قلمبند کئے ہیں اور ہمارے مسلم عظیم آبادی نے الناظر

مارچ و اپریل کے دو نمبروں میں ان کے حالات پر ایک مضمون لکھا ہے ورنہ ان کے حالات بھی دوسرے شاعروں کی طرح گوشۂ تنہائی میں پڑے رہتے۔ لیکن ہمیں صرف یہ کام ہی نہیں کرنا ہے کہ چند شاعروں کے حالات لکھدیں اور ان کے اشعار نقل کر دیں بلکہ ہمیں نہایت واضح طور پر یہ بھی بتانا ہے کہ نہ صرف نظم بلکہ نثر، تاریخ، فنونِ لطیفہ، فلسفہ و منطق، طب، اصول قواعد، مذہبی تصنیفات (معقولات و منقولات) تذکرہ، اہل علم کی قدر دانی۔ اساتذہ کی تربیت و پرورش، علم دوستی و تعلیم پرستی، ذوق و شوق و مذاقِ علم جتنی اس قسم کی چیزیں ایک زبان کی ترقی میں مدد دے سکتی ہیں سب کی سب بہار میں موجود تھیں۔ اور بہار نے بحسن و کمال اُس کو ادا کیا۔

نظم (شاعری)

شعر دنیا کی سب سے اولین علمی ایجاد ہے۔ چنانچہ مرزا صائب فرماتے ہیں :-

آں کہ اوّل شعر گفت آدم صفی اللہ بود طبع موزوں حجتِ فرزندیِ آدم بود

حضرت خسرو دہلوی اسے یوں ثابت کرتے ہیں :-

ما ہمہ در اصل شاعرزادہ ایم دل بایں حجت نہ از خود دادہ ایم

اس بنا پر جس چیز نے ہمارے خانۂ سخن میں پہلے پہل جنم لیا وہ شاعری تھی۔ اور اس جماعت کا پیش رو بیدل تھا جس کے حالات آگے بیان کئے جا چکے ہیں اور اس کی ضرورت نہیں۔ حضرت بیدل نئی اُردو میں عہد عالمگیری و بہادر شاہی میں تھے لیکن حضرت خسرو کے عہد کے پہلے بھی یہاں ایسے شاعر ہو گزرے ہیں جنہوں نے فارسی الفاظ کو بھاشا میں ملا کر اشعار لکھے ہیں۔ چنانچہ جس وقت ناصر الدین اور اس کے بیٹے معز الدین کیقباد میں لڑائی ہوئی ہے اس کے بارے میں ایک بہاری شاعر نے پورے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اور حضرت خسرو نے بھی ایک مثنوی بزبان فارسی موسوم بہ قرآن السعدین میں تمام حالات لکھے ہیں۔ بہاری شاعر کا صرف ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے اس کو تبرکاً درج کرتا ہوں۔

منکی اوجڑی نگری کو تب کریں آباد ان — ناصر دین سے جب ملیں موجدین کباد ان[1]

اس کے بعد بھاشا کی شاعری میں اُردو کے الفاظ کثرت سے ملتے گئے۔ چنانچہ جب شیر شاہ نے رہتا سگڈھ کے قلعہ کو دھوکے سے حاصل کیا تو اس کا ایک ساتھی یہ شعر دیوار پر لکھکر روانہ ہوگیا۔

ساتھ کرے پٹھان کا سو اوبھی گیدی کھر (خر) — جیہ ڈار کا میوا توڑیں کاٹیں اوہ کی جڑ

ان اشعار کے علاوہ ہمیں ابتداء عہد کے لئے ایک چیز کا اور پتا لگا ہے یعنی صوبہ بہار میں ایک قوم مسلمان جو اپنے کو ملک کہتی ہے، آباد ہے۔ اس کے یہاں شادی میں ایک قسم کا گیت گایا جاتا ہے جس کو "غوم" کہتے ہیں۔ اُس سے پتا چلتا ہے کہ شجر اُردو کا ابھی ابھی شگوفہ دا ے نکلا ہے وہ یہ ہے۔

"پوتا غوم سے دھیا غوم سے یہ غوم یترے — بڑوں سے اوترا + تکے سے چل کر ایران میں آئیو

ایران میں عباس (شاہ فارس) ظلم مچائیو۔

تخت وزیران نے ہندو لی ہے — کفر او جڑ کے دین لبی ہے

ایسے وزیران کا نیاز ہے — پوتا غوم سے۔"

شیر شاہ کی وفات کے چند ہی سال بعد پھر مغلوں کا عروج ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی مغلوں، افغانوں، ہندوں کے میل ملاپ نے بھاشا اور فارسی میں بھی زیادہ اشتراک و میل و جول پیدا کردیا۔ اور ایک صاف و شستہ زبان کی بنیاد ڈالی گئی۔

شاعری جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں انسانی جذبات و خیالات، حیات فطرت و محسوسات نیچر و اثرات قلب و دماغ کے اظہار کا نتیجہ ہے۔ ایک شخص پانی کی روانی کو دیکھ کر بے اختیار اس کے پاس جاکر اس سے کھیلنے لگتا ہے دوسرا گنگنانا شروع کردیتا ہے اور تیسرا ساکت بیٹھ کر محوِ نظارہ ہوجاتا ہے۔ اور چوتھا ان اثرات کو لباس الفاظ سے ملبس و زیورِ وزن سے آراستہ کرکے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ سب شاعری کی مختلف حالتیں ہیں۔ لیکن اب ہم نے اصطلاحی معنوں میں لفظ شاعری کو محدود کردیا ہے اور اس کے اب صرف یہ معنی رکھے ہیں کہ کلام موزوں کا

---

[1] معزالدین کیقباد۔

نام شاعری ہے" اور اس تعریف نے جہاں ایک طرف ہم سے تین قسموں کے "ساکت" شاعروں کو چھین لیا اس کے ساتھ ہی دوسری طرف ایسے تُک بند شاعر پیدا کر دیئے کہ جو حشرات الارض اور ذرہائے ریگستان سے زیادہ ہیں اور اس کے اعتبار نیک و بد کے لئے ایک مطالعۂ عظیم و قوتِ ناقدانہ بلیغ چاہیئے، ورنہ معمولی غوطہ زنی سے اس دریاسے در بے بہا نکالنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم کو ایک بات اور یاد رکھنی چاہیئے کہ یورپ کی شاعری کے برخلاف ہمارے یہاں زبان دانی کے جوہر اسی کسوٹی پر کھلتے ہیں اور کمالات کے سیّارے اسی فلکِ شاعری پر چمکتے ہیں، حتیٰ کہ شعر کے محاورہ کی معمولی سی معمولی غلطی پر بھی شاعر نظروں سے گر جاتا ہے اور شعر تو شعر ہی باقی نہیں رہتا۔ اُردو زبان کی شاعری کی خصوصیت کے لئے سب سے پہلی بات جو سمجھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ یہ فارسی شاعری کی بیٹی ہے اور فارسی شاعروں کے گودوں میں پلی ہے۔ اس لئے ایرانی خصوصیات تمام تر اس میں موجود ہیں اور چوں کہ بھاشا سے چولی دامن کا ساتھ ہو چکا تھا اور دونوں ایک چنے کی دو دالیں تھیں، اس لئے ہماری شاعری بھاشا کی شاعری کے اثر سے بھی محفوظ نہ رہ سکی اور دونوں ملا کر ذیل کی چیزیں ہماری شاعری کے لئے ضروری ثابت ہوئیں۔ فصاحتِ زبان، تذکیر و تانیث، محاورات و اصطلاحات، روانی، صحتِ زبان، سلسلۂ خیالات، بلند پروازی، نازک خیالی، جوشِ بیان، نشستِ الفاظ، عمدہ بندش، رعایت لفظی، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام شاعری کے جزو لاینفک ہیں اور جہاں اس میں سے ایک بات کی بھی کمی ہوئی تو شعر شعر باقی نہیں رہتا؀۔ اس لئے زبان دانی کے اعتبار سے ہمیں اپنے خزانۂ علمی میں شاعری سے بڑھکر کوئی چیز نہیں مل سکتی کہ جس سے اپنی خدمت و قدر و وقعت کو بتا سکیں۔ اس وقت عام طور سے اُردو کے دو مدرسے (اسکول) مانے جاتے ہیں۔ لکھنؤ اور دلّی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر عظیم آباد کے ادبی و علمی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ صوبہ بھی کسی حیثیت سے ان دونوں شہروں سے کم نظر نہ آئے گا۔ بلکہ پوری تحقیق و تنقید کے بعد ہم کو ماننا پڑے گا کہ ارتقاع و ترقی اُردو میں بھی اتحاد ثلاثہ کا حصہ مساوی ہے اس لئے سب سے پہلے ہم کو شاعری کی ارتقائی کیفیت تا ایں زمانہ بتانی چاہیئے۔ اور دکھانا چاہیئے کہ جس عہد میں

؀ کیا رعایت لفظی کے نہ ہونے سے بھی؟ [اڈیٹر]

دلّی و لکھنؤ کی جو زبان تھی وہی عظیم آباد کی بھی رہی ہے اور اس صوبہ نے اس کے تکمیل میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ولی کے بعد سے شاعری دلّی میں شروع ہوئی۔ اور اسی عہد سے اس کا وجود صوبہ بہار میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اُس زمانہ کے ایک مشہور شاعر عبدالقادر بیدل کا حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اُسی زمانہ کے دوسرے شاعر جو خاکِ وطن سے پیدا ہوئے وہ ملّا محمد علیم تحقیق تھے۔ یہ حضرت بیدل سے بھی پہلے ہو گزرے ہیں اور اُن کا زمانہ عالمگیر بادشاہ کا زمانہ ہے۔ مغلپورہ عظیم آباد اُن کا مولد و مسکن تھا اور مدفن بھی وہیں ہے۔ فارسی شاعری میں اُن کا کلام بہت مقبول ہے۔ ریختہ میں بھی کبھی کبھی کہہ لیتے تھے۔ اور جو کچھ کہتے تھے وہ اُس زمانہ کے شاعروں کی طرح ہوتا تھا۔ سعدی دکنی وغیرہ کے کلام سے ان کا کلام لڑتا ہوا ہے۔ صاحب نوائے وطن ان کی شاعری پر تنقیدانہ لکھتے ہیں:۔

"تمام زمانے نے ان کو بہ استادی مان لیا ... ...

"عظیم آباد کے حکام اور صوبہ دار ملّا صاحب کی بہت عزت کرتے تھے اور مسند پر اپنے ساتھ بٹھاتے تھے"

انھوں نے شاہجہان کا آخری زمانہ بھی دیکھا تھا اور اس ابتدائی اُردو زبان میں آپ کا کلام موجود ہے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لکھنؤ تو کیا دلّی میں بھی اُردو کا کوئی شاعر موجود نہ تھا ان کے دو شعر یہ ہیں۔

دیکھوں ہوں جو تجھ مکھ کوں نیناں میرے چندھرا ہے　　سرجن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن دہا ہے

سلونو سانورے ادھر کوں آجا　　جھگڑا باندھ کر دلموں سماجا

ان کی زبان اُس وقت کی مروجہ اُردو سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ خیالات کی بلندی بھی ظاہر اور الفاظ کی شیرینی بھی۔

عالمگیر بجا مذہبی بادشاہ تھا اور مدبر بھی۔ وہ جانتا تھا کہ شاعر جھوٹی مدح سرائی کر کے ایک طرف تو بادشاہوں کا دماغ خراب کرتے ہیں اور دوسری طرف انعام و اکرام پر بھروسہ کر کے محنت و کوشش کو ترک کر دیتے ہیں اور خیراتی ٹکروں پر گزارہ کرنا چاہتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ بادشاہِ وقت کی پسند مرضِ متعدی ہے۔ بادشاہ کی پسند رعایا کی پسند ہے اور اگر بادشاہ کو شعر و شاعری کا ذوق بے حد ہو تو

اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر چھوٹا بڑا ذی ثروت شخص بھی ایک دو شاعر اپنی جلو میں رکھے گا۔ چنانچہ تاریخ ہی کی شاہد ہے کہ جس عہد میں بادشاہ نے اُن کی حوصلہ افزائی کی، معمولی سے معمولی نواب بھی اپنے یہاں دو چار شاعر رکھ لیتے اور کل آمدنی کی کم از کم ¼ اُن کی نذر ہو جاتی تھی اور شاعری ایک مستقل مہذب پیشہ گداگری کی صورت اختیار کر چکی تھی، اگر کسی نے ان کو دو پیسے دیئے تو اس کی اتنی مدح کرینگے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور اگر اُمید سے کم ملا تو پھر اس کی کوئی ایسی بُرائی نہ ہوگی جس کو رائی کا پربت کر کے نہ دکھائیں گے۔ یہ حال صرف چھوٹے شاعروں ہی کا نہیں ہے بلکہ فردوسی، حافظ، انوری، سلمان، سودا، انشا، فغاں جیسے بڑے بڑے شاعر بھی اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔ آخری عہد میں تو "آزادوں" کی ایک جماعت ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اور میرا تو یقین ہے کہ اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب میں ایک بڑا سبب شعر و شاعری ہے۔ بہادر شاہ نے شاعری ہی میں سلطنت کھوئی۔ واجد علی شاہ شاعری ہی کی بدولت معزول ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک خود مستقل بحث ہے اور موضوع سے باہر ہونے کی وجہ سے نظر انداز کی جاتی ہے۔

بہر حال اُن کی وفات کے بعد کچھ تو سلطنت کی کمزوری اور کچھ آزادی نے پھر اس دبی ہوئی چنگاری کو مشتعل کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اُردو شاعری کے بچّے نے ایک نئے سال میں قدم رکھا۔ اور دَورِ اول کے شاعر پیدا ہوئے۔

(۱) ولی (۲) آبرو (۳) بیدل عظیم آبادی (۴) مضمون (۵) ناجی بہاری وغیرہ۔ ان میں سے دو تو خاص بہار کے ہیں۔ بیدل کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ اور ناظرین نے ان کے مختصر کلام ہی سے ان کی قدرتِ زبان و بلند خیالی کا پتا لگا لیا ہوگا۔ رہے حضرت ناجی ان کے بارے میں مولانا آزاد آبِ حیات میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ناجی تخلص۔ سید محمد شاکر نام۔ شرافت اور سیادت کے ساتھ کمال شاعری سے اپنے زمانہ میں نامور تھے۔ اہل سخن نے انھیں طبقۂ اول کے ارکان میں تسلیم کیا ہے"

شاہ مبارک آبرو نے ان کی تعریف میں لکھا ہے:۔

سخن سنجان میں ہو گا آبرو آج | نہیں شیریں زباں شاکر سری کا

مصنف گلشنِ بیخار نے ان کے چند اشعار منتخب کئے ہیں وہ یہ ہیں :-

تیری نگاہ کی حسرت سے اے کماں ابرو | ہمارے سینوں میں تو دہ ہوا ہے تیروں کا

دیکھ دلبر تیری کمر کی طرف | پھر گیا پانی اپنے گھر کی طرف

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ | پاس میرے جب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

غرض غصّے میں کبھی اہل وفا کی نہ سُنے | ہٹ پہ آجاوے وہ کافر تو خدا کی نہ سُنے

گو ناجی ولی کے عہد کے تھے، لیکن اُن کی زبان اتنی صاف ہو گئی تھی کہ عہد ولی کی مخصوصات تک کا ان کے اشعار میں پتا نہیں چلتا۔ مثلاً ولی کے زمانہ میں 'سون وسین' بجائے سے۔ کون، ہمن کو، جگ منے، یورہ وغیرہ وغیرہ بہت کثرت سے مستعمل ہیں۔ لیکن ان کا کچھ نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

اس کے بعد دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ گو اس وقت بھی اُردو کی زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی اور جنے اور کتنے کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے، لیکن سجن، بل، کسون وغیرہ کے الفاظ متروک ہو چکے تھے اور دلّی ولکھنؤ میں فغاں و آرزو سے شاعر پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں سے اول الذکر کی اگر کہیں قدر ہوئی ہے تو اسی عظیم آباد میں۔ اُس وقت مہاراجہ شتاب رائے کا دَور دورہ تھا۔ خود ذی علم سخن سنج وسخن فہم تھے۔ اور خود اُن کے صاحبزادے بہت اچھا کہتے تھے۔ اُردو اُردو ہو رہی تھی۔ اس وقت کے دو شاعر یہ ہیں۔ ان کی زبان دیکھو اور خود موازنہ کرلو کہ یہ زبان کسی حیثیت سے فغاں و آرزو سے کم ہے۔

ان میں ایک بیت قلی خاں حسرت تھے۔ صاحب گلشنِ ہند تحریر فرماتے ہیں :-

"بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے۔ بذلہ گوئی اور علم مجلس میں انتخاب تھے۔ قریب دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی ودمان کا ہے۔"

ان کا کلام ملاحظہ ہو :-

رات کا سچ ہوا خواب مرا | مل گیا صبح آفتاب مرا

تیرے کوچہ سے باز نہ آتا | یہ دلِ خانہ خراب مرا

دل ہوا غم میں آب کی سی طرح　　پر جلے ہم شراب کی سی طرح

زلف و رخِ یار دیکھتا ہوں　　لیل اور نہار دیکھتا ہوں

پھر یار سے ان دنوں ہیں بارے　　صحبت کو برآر دیکھتا ہوں

سُنا ہے آج میخانے میں جامِ مے پہ مستوں سے　　لٹایا دین و دنیا دونوں ہمّت اس کو کہتے ہیں

ان پتنگوں کی میں جرأت پہ ہوا جاتا ہوں　　بے کلیجے ہیں یہ کم بخت تھر چلتے ہیں

ترا غرور مرے عجز کے مقابل ہے　　اودھر پہاڑ ادھر ایک شیشۂ دل ہے

ایک ایک شعر لاکھ لاکھ کا ہے۔ صرف اہل نظر و سخن فہم حضرات اس کی داد دے سکتے ہیں۔ لگے ہاتھوں ایک رباعی بھی سُن لیجئے ؎

زاہد جو نہیں ہے مرے دل سے آگاہ　　کہتا ہے کہ کافر ہے تو اے روئے سیاہ

ہوں جس کی پرستش میں کہوں کیا یارو　　آتا ہے وہ بُت دیکھو اللہ اللہ

اللہ اللہ کیا کلام ہے۔ ایک رباعی اور ملاحظہ ہو ؎

میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی　　زاہد و واعظ سے دُور ہٹکی ہٹکی

قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے ہرگز　　یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

سبحان اللہ، دوسرے راجہ بہادر فرزند راجہ شتاب رائے متخلص بہ راجہ تھے۔ گلشن بیخار نے لکھا ہے :-

"راجہ تخلص۔ راجہ بہادر فرزند راجہ شتاب رائے ناظم بنگال و بہار بودہ"

ان کا صرف ایک شعر میری نظر سے گزرا ہے۔ وہ یہ ہے۔

یہ زخمِ دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے　　ہم اُن تلک نہ پہنچے وہ ہم تلک نہ پہنچے

اس دور کے ایک اور شاعر حضرت جوشش ہیں ان کے بارے میں مسٹر سری رام مصنف خمخانۂ جاوید تحریر فرماتے ہیں۔

"وہ طبقۂ دوم کے اخیر شعرا میں تھے ... ... خوش لیاقتی آپ کی افزوں از تحریر ہے۔ نظم ریختہ میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اور معنی بیگانہ سے طبیعت کو از حد لگاؤ تھا۔

چاشنی درد کی آپکے کلام سے ظاہر اور علم عروض سے بخوبی ماہر تھے ...... طرز سخن نہایت پسندیدہ و مرغوب اختیار کیا تھا، اسلوب بیان دل کش و موثر ہے۔ بندش نہایت صاف، مضمون خوب نکالتے ہیں،،

انتخاب ملاحظہ ہو:۔

کس طرح سے اوصاف ہو خلاقِ جہاں کا — قدرت نہ قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا
عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت — مہتاب کو دیکھے نہیں مقدور کتاں کا

دیکھ کر رنگ صنم تیری حنا کاری کا — کوہ کن ہو تو نہ دم مارے وفاداری کا
چشم پر آب ہے، لب خشک، دماغ آشفتہ — روز عالم ہے غرض دل کی گرفتاری کا

قیس پھرتا جو رہا دشت میں دیوانہ تھا — اس کو لیلےٰ ہی کے دروازہ پہ مرجانا تھا

بیکسی سے یہی گلہ ہے مجھے — تھام لیتی ہے دستِ قاتل کو

جی میں جس وقت کہ مضمون گہرا آتا ہے — بس کہ نازک ہے مجھے باندھتے ڈر آتا ہے

ان دونوں دوروں کے درمیان تقریباً پچاس سال گزر گئے اور اس نصف صدی میں اُردو کہاں کی کہاں پہنچ گئی۔ پرانے الفاظ، کثرت آمیزش فارسی یا بھاشا۔ ترکیب قدیم، طرز تحریر، یہ تمام چیزیں ایک دم سے دوسری ہو گئی تھیں۔ اس کے ساتھ شاہی تربیت و مرحمت خسروانہ بھی اس کو حاصل تھی۔ اور بادشاہ وقت و نوابانِ اودھ، والیان ملک اور صوبہ دار تمام شعر کہتے تھے اور اس کی قدر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اُردو شاعری ایک مستقل فن بن گئی تھی۔ کیوں کہ ابتدائی عہد کے جو ریختہ گو ہیں ان کے کلام میں اُردو کا حصہ بہت کم ہے۔ بیدل کی صرف چند غزلیں کہنے رہ گئے ہیں۔ فغاں کا ۳/۴ دیوان فارسی کا ہے۔ لیکن اس دَور کے

بعد سے اصلی شاعری اُردو کی شروع ہوئی اور فارسی بطور چٹخارے کے استعمال ہونے لگی۔ چنانچہ سوداؔ وغیرہ کو دیکھئے۔ مولانا آزاد اپنی مشہور کتاب آبِ حیات میں اس دَور کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"زبان اُردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا ہے جس سے ہزاروں ضروری کام اور آسائشوں کے سامان، حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوتے ہیں۔"

یہ وہ دَورِ سعید ہے، جس کی بہار پُر اُمید ہے، اور جیسے میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مظہر جانِ جاناں، راسخ عظیم آبادی بیدلؔ عظیم آبادی سے شاعر پیدا کئے۔ میر غلام حسین شورشؔ، دلؔ وغیرہ کا کلام کسی حیثیت میں اساتذۂ وقت کے کلام سے کم نہ تھا۔ اس عہد کی تمام خصوصیات اُن کے کلام میں موجود ہیں اور اس کی دلیل پیش کرنی بے سود ہے۔ کیوں کہ ان کا کلام خود ان کا شاہد ہے اور آپ خود اس کا مطالعہ کر کے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ دعویٰ غلط ہے یا صحیح۔

حضرت راسخ کا کچھ حال ہم اُردو کی تاریخ کے ضمن میں لکھ آئے ہیں۔ یہاں صرف ان کے کلام کا انتخاب جو بہت کوششوں کے بعد ہاتھ لگا ہے، لکھا جاتا ہے۔ ان کا ایک دیوان مطبع خیر المطابع پٹنہ میں چھپنا شروع ہوا تھا لیکن معلوم نہیں کیوں تکمیل کو نہ پہنچا۔ جو کچھ بھی ان کا کلام ہاتھ لگا اس سے حسب ذیل اقسام کے کلام کا پتا چلتا ہے اس میں ۳۴۲۰ غزلیں، ۸۳ رباعیاں، ۲ خمسے، ایک واسوخت دو مرثیے، ایک واقعہ اور حسن و عشق، نازونیاز، سلسبیلِ نجات، نیرنگِ محبت، جذبِ عشق، اعجازِ عشق، نور الانظار، گنجینۂ حسن، مرآۃ الجمال، مکتوبِ شوق، شرحِ حال، مثنوی قدیم اور ۸ قصیدے ہیں۔

انتخاب کلام کا یہ ہے:۔

رُخِ زیبا دیا گُل کو دلِ بے صبر بلبل کو — اِسے خنداں کیا پیدا اُسے گریاں کیا پیدا

بے دردی سے طے کیجئو نہ راہِ طلب — ہاں ٹوٹنے پائے نہ پاؤں کا کوئی چھالا

میری متاعِ عجز بھی کی ناپسند ہائے — بولے کہ اس متاع پہ تجھکو غرور تھا

پہلے مجھی کو لے گئی ساقی کی چشمِ مست — یا آنکہ مجھکو سب سے زیادہ شعور تھا

دکھ لئے، ترکِ جو نظارۂ دلدار کیا
ہائے پرہیز نے دونا ہمیں بیمار کیا

وعدہ وابستۂ حشر اور ہم ایسے بے خبر
کیا قیامت ہی عجب وعدۂ دیدار کیا

تم نے راسخ تنِ عریاں پہ جو توڑے ناخن
کیا نمک پاشی کا اُس شوخ نے اقرار کیا

ہوئے مسجودِ ملائک کب یہ رتبہ خاک کا
اس میں اک سر ہی جو دل خوں کن ہی وہ ادراک کا

ہمارا ہم سخن مدت تلک عشقِ پر افسوں تھا
دل آتش تھا سراسر، آب تھیں آنکھیں، جگر خوں تھا

کہاں کی لیلےٰ و مجنوں یہ سب اسمائے فرضی ہیں
مسمیٰ اور ہی شئے تھا نہ لیلےٰ اور مجنوں تھا

سعی سے اپنی نہ معشوق تلک ہم پہنچے
عاقبت جذب اُنہیکا ہوا رہبر اپنا

ہو صرفہ جاں کا راسخ زہے شعور
پھر اُس پہ نام لو مری جان عشق کا

چراغِ خانہ مت سمجھو چراغِ عشق کو راسخ
کہ اُس میں چاہیئے روغن پر اس میں خوں تمنا کا

فردوس سے وہ نکلا میں کوچۂ جاناں سے
رونے کو مرے پہونچا رونا کہاں آدم کا

اسی خیال کا غالب کا بھی ایک شعر ہی :۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے
(غالب)

پابندِ تعلق نہیں ہوتا دلِ عاشق
آزاد ہی ہر شئے سے بیمارِ محبت

میں تو کہتا ہوں کہ گل سا رکھتے ہو رخسار تم
کیوں ہو اتنی بات پر مرے گلے کے ہار تم

دیکھ روتا مجھکو ہنسکر بولے یوں روتا ہی کیوں؟
میں کہا مجبور ہوں بولے کہ ہو مختار تم؟

تجھسے وابستہ ہی جلوہ کی تمہارے رونق
میں سیاہ بخت بھی ظلمت ہوں اگر نور ہو تم

طالبانِ یار کی منزل تو غیر از دل نہیں
کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہی منزل نہیں

چشمِ تر کا ہو سکے ہی روکش اب جیحوں کہاں
میرا صحراء وسیع دل کہاں ہاموں کہاں

قتلِ موعود کی حسرت میں ہوئے اہلِ نیاز
ہمنشیں سیر تو کر ناز کی طغیانی کی

کاش یہ زلفِ دراز اپنی نہ کھولی ہوتی
تم نے کیوں طول دیا میری پریشانی کو

ترجیح دو اُن لمبے بالوں پہ نہ سنبل کو
خاموش رہو یارو کیوں بات بڑھاتے ہو

نہ چشمِ کم سے دیکھ اے ابر! اشکِ چشم کو میرے
یہ قطرہ قابلیت اس کی رکھتا ہے کہ دریا ہو

غالبؔ نے بھی اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیِ منصور نہیں (غالب)

لذتیں غم کی تیرے ہو جیو راسخ یہ حرام
دل میں کچھ اور اگر غم کے سوا رکھتا ہو

خوں بہا میرا یہی ہے کہ کہو
"یہ میرا کشتۂ تمنا ہے"

سارے خطِ شوق میں میں نے یہی رو رو لکھا
ہائے صاحب کیا کیا تم نے جدا تم کیوں ہوئے

اُس شرمگیں نگہ سے جگر سب فگار ہے
واں تیرِ نیم کش ہے یہاں دل کے پار ہے

سبحان اللہ زبان بالکل میرؔ کی، خیالات وہی تصوفانہ، بلند پروازی وہ کہ طائرِ خیال کی بھی رسائی نہ ہو اس انتخاب میں ہر صنعت کے اشعار ہیں۔ اس میں رعایت لفظی کی بھی مثال ملیگی اور روشِ بیان کی بھی۔ غرض کہ یہ ایک چھوٹا سا چمن ہے جس میں فصاحت و بلاغت کے گل بوٹے اور مضامینِ عالیہ کے تختے ہیں۔ کیا اس عہد کا کلام دیکھکر کوئی صاحبِ علم کسی حالت میں کسی حیثیت سے کہہ سکتا ہے کہ صوبہ بہار زباندانی کی حیثیت سے دوسرے مقامات سے ذرّہ برابر بھی کم رہا ہے؟ اسی عہد کے دو شعرا کے کلام کو ملاحظہ فرمائیے اور دادِ سخن دیجئے۔

حضرت شورشؔ کا نتیجۂ فکر ملاحظہ ہو :-

ہمارے پاس بھی آیا نہ آیا
بھروسہ کیا ہے جی آیا نہ آیا

کسی کو خُم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام
قسم مغاں کی ہے ساقی کہ مجھکو نام سے کام

اُٹھی یہ اُلفتِ گل کے سبب سے سب ایذا
وگرنہ کیا تھا ہمیں ہمصفیرو! دام سے کام

رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورشؔ
ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام

ان کا طرز میرزا سودا کا سا ہی۔ اب اس عہد کے ایک اور ممتاز بہاری شاعر کا کلام بھی سن لیجئے۔

تیری زلفوں میں پھنسا دل یہی تقصیر ہوئی   نقدِ جاں لیجئے حاضر ہی گنہگاریِ دل

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ   رہتا ہی مدام آب دیدہ

ہمارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی   برنگِ نقشِ قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

اس دَور کی زبان دیکھ کر کون منصف مزاج شخص ہو گا جو یہ نہ کہہ اُٹھے گا کہ بیشک بہار کسی حیثیت سے یا کسی لحاظ سے لکھنؤ اور دلی یا کسی دوسری جگہ سے ذرّہ برابر بھی کم ہی اور اس نے زبان کی ترقی میں مساوی حصہ نہیں لیا لیکن یہ بدبختی ہماری ہی کہ ہم نے کبھی آبا و اجداد کے کارناموں کو کسی کے سامنے پیش نہ کیا۔ اور آج دنیائے سخن میں کوئی ان پیمبرانِ عہد کو جانتا بھی نہیں۔ اور اکثر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ گو کہ اس میں تعصب کو بھی بہت کچھ دخل ہی۔ لیکن اس میں سب سے زیادہ قصور ہم لوگوں کا ہی۔ جواہرات کو دفن کرکے رکھنا اور بازار میں اس کے تذکرہ و تعریف کی خواہش حماقت سے کم نہیں۔ اس لئے بہاریوں ہی کا یہ فرض اولین ہی کہ اپنے اسلاف کے کارناموں ان کی علمی خدمات کو عام پبلک کے سامنے پیش کریں اور وہ اعترافِ کمال پر مجبور ہونگے۔ ورنہ دعویٰ بے دلیل عبث و بے کار ہی۔ بلکہ آفتاب کو خود دلیلِ آفتاب بن کر سامنے آنا چاہیئے۔ میں موضوع سے الگ ہوگیا۔ اب پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اس دور ثالث کے بعد دور رابع میں اُردو کی زبان اور زیادہ صاف ہوگئی اور اگرچہ مصحفی و انشاء، جرأت وغیرہ کے کلام میں "بولا" میں جھانکا میاں وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں لیکن شاذ و نادر۔ دوسرے اس دَور کی دوسری خصوصیت یہ ہی کہ اس بزم کے تمام شعرا زندہ دل تھے اور ہنسی قہقہہ کے سوا کوئی نئی بات کلام میں پیدا نہیں کی گئی۔ البتہ ریختی کی ایجاد کا سہرا اسی دَور کے ایک بزرگ میاں رنگین کے سر رہا۔ لیکن چوں کہ یہ اخلاقی حیثیت سے گری ہوئی چیز تھی اس لئے زیادہ لوگوں نے اس پر توجہ نہ کی اور اس کی بیل زیادہ نہ بڑھ سکی۔ گو میرزا نواب اور جان صاحب وغیرہ نے انشا و رنگین کے بعد اس میں بہت کچھ رنگینی کرکے اس کو ترقی دی۔ لیکن کچھ زیادہ دیر یہ نہ رہی اور اب شاید اس چراغِ کشتہ کا دھواں بھی فضا میں موجود نہیں۔ اس عہد کی شاعری کی تیسری خصوصیت کلام کی شوخی ہی۔ چنانچہ انشا کی یہ غزل مشہور عام ہی۔

جھڑکی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی، سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

اور خصوصاً یہ شعر۔

گر نازنیں کے کہنے سے مانا بُرا ہو کچھ میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

اسی طرح اور اسی رنگ و زبان کے بہت سے شعرا صوبۂ بہار میں بھی پیدا ہوئے۔ جو شاعری کی حیثیت سے بہت ممتاز ہیں۔ لیکن تذکروں میں ان کا کلام بہت کم دستیاب ہوتا ہے۔ ان میں کیفی، غنی، جنون، ثابت، تمنا خواجہ امین وغیرہ مشہور روزگار بزرگ ہیں۔ خواجہ امین کا کلام ملاحظہ ہو:۔

مانند نگیں آپ سے کاوش میں پڑا ہے مشتاق جو کوئی ہے یہاں نام و نشاں کا

پردے سے جو وہ شہرۂ آفاق نکلتا تب دیکھتے خورشید کا یہ نام نکلتا

گھر مرے آنا اگر منظور تھا آئے ہوتے لطف سے کیا دور تھا

ہم کو کیا گر بہار آئی دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا

گالیاں غیر سے سناتے ہو ہاں میاں تم سے اور کیا ہوگا

خورشید تیرا دیکھ کے منھ کانپ کے نکلا وہ چادرِ مہتاب میں منھ ڈھانپ کے نکلا

شور ہے عالم میں تیرے حسنِ عالمگیر کا تو ہی ہوگا گر کوئی ہوگا تری تصویر کا

مجھے بے چین رکھتا ہے دلِ افگار پہلو میں وہ سوئے کس طرح جس کے رہے بیمار پہلو میں

کیا کہیں دودِ آہ کی تاثیر گھر کا گھر ہے سیاہ مت پوچھو

کیا دین سے غافل ہیں امیں مردمِ دنیا سکہ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا الٰہی

رباعی

اظہار نہیں اگرچہ سر کا پر بوجھ اتاروں ہوں اپنے سر کا

سائل کو جوابِ ترش ہرگز مت دے بھوکا ہے کیا کرے گا لے کر سرکا

یہ جور و جفا و بے وفائی کب تک ۔۔۔ بس کیجئے پاسِ آشنائی کب تک
کرتا ہے کوئی حسن پر اتنا بھی غرور ۔۔۔ دیکھیں تو رہے ہے یہ خدائی کب تک

ان کا کلام کسی صورت سے اس عہد کے اعلیٰ سے اعلیٰ شاعر سے کم نہیں۔ اور تمام اشعار اُسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ آب حضرت جنون کے بھی چند اشعار سُن لیجئے۔ ان کے بارے میں صاحب خمخانۂ جاوید تحریر فرماتے ہیں:۔

"نہایت خوش مذاق اکثر فنون میں قابل اور کامل۔ بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے۔ مگر مشقِ سخن میں وہی انہماک تھا۔"

کب ماہ اس نمک میں ہم سنگ ہے تمھارا ۔۔۔ تھا کہ حُسنِ یوسف پاسنگ ہے تمھارا
آنکھیں بھی چڑھ رہی ہیں مُنھ بھی اُتر رہا ہے ۔۔۔ کچھ رنگ ان دنوں میں بے رنگ ہے تمھارا
وہ آنکھ دے کہ جس سے دیکھیں جمال تیرا ۔۔۔ یارب جنوں کے مُنھ پر اس مُنھ کو باز کرنا
پہنچا کوئی کعبہ سے کوئی دیر سے پہونچا ۔۔۔ تھی جس پہ تیری نظر وہی خیر سے پہونچا
تری چشم مست سے ساقیا یہ سیاہ مستِ جنوں ہوا ۔۔۔ کہ مئے دو آتشہ طاق پر جو دھری تھی وہیں دھری رہی

اب ثابت کا کلام بھی دیکھئے اور مضامین جدید سے لطف اُٹھائیے۔

وقت مرنے کے میرے پاس وہ موجود ہوا ۔۔۔ اپنے ہی جی کا زیاں اپنے لئے سود ہوا
مجمرِ سینہ میں دن رات پڑا جلتا ہے ۔۔۔ آہ ثابت یہ ترا دل نہ ہوا عود ہوا

اب اس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت میر شمس الدین تمنا عظیم آبادی کے بھی چند اشعار سن لیجئے۔

شبِ فرقت میں تیری نالہ و زاری ہے اور میں ہوں ۔۔۔ جھپکتی پل نہیں آنکھیں ہیں بیداری ہے اور میں ہوں
چمن ہے خندۂ گل ہے مئے و مینا ہے اور تو ہے ۔۔۔ فغاں ہے نالہ ہے، فریاد ہے، زاری ہے اور میں ہوں

لیجئے یہ دَور بھی ختم ہوتا ہے اور اب بالکل نیا منظر ہے۔ اللہ اللہ اس نئے عہد کا کیا کہنا۔ پُرانا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ لکیر کے فقیر گزر چکے تھے اور اب باپ دادا کی جمع کی ہوئی دولت کو گھر بیٹھے کھا چکے تھے اس زمانہ کے شاعروں کو ضرورت ہوئی کہ نئے جواہرات حاصل کریں اور اپنے گھروں کو نئے سامانوں سے پھر سجائیں اور بمصداق کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ ایجاد و اختراع کے گُل بوٹے لگائیں یہ عہد دورِ رابع سے شروع ہو کر ذوق و غالب تک ختم ہوتا ہے

اس کی صد ناسخ، آتش، مومن، خلیق، انیس، دبیر، ذوق، غالب جیسے پیغمبرانِ سخن اور زبانِ اُردو کی شباب کا زمانہ ہے۔ دلّی اُجڑ کر لکھنؤ بس چکا تھا اور خود سر زمین لکھنؤ سے شاعر پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس دَور کی خصوصیات میں دو تین چیزیں خاص طور سے انسان کی توجہ مبذول کرتی ہیں۔ اوّل تو زبان نہایت صاف و شستہ ہو گئی تھی۔ دوسرے خیال آفرینی کے باغ لگ گئے تھے اور تمام صنائع و بدائع کلام کی دوکان سج گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب رحمۃ اللہ ایک طرف ہیں اور تمام اُردو شاعری ایک طرف۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس زمانہ کے بہاری شاعر بھی اس کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں۔ اس عہد کے اساتذہ میں سید شاہ الفت حسین فریاد اُستاد حضرت شاد، منشی آنند رام الفت، انور علی انور۔ حیرتی، منشی گنگا لعل دماغ وغیرہ وغیرہ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اب ہم کو اس میں سے ایک ایک کا کلام تنقیدانہ نظر سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ اس عہد کے تمام شرائط پورا کرتا ہے یا نہیں اور زبان کی صحت و درستی کے لحاظ سے ٹھیک اور درست ہے کہ نہیں۔ حضرت فریاد کی حسب ذیل تصانیف میری نظر سے گزری ہیں۔

مثنوی دبستانِ اخلاق، مثنوی روضۃ المعانی، مثنوی گنجینۂ عشق، مثنوی طلسم جہاں ۶ یا ۷ ناتمام مثنویاں اور ایک فارسی غزلوں کا دیوان، اُردو فارسی کے کئی قصائد ان کا اُردو کا دیوان کلکتہ میں نذر آتش ہو گیا تھا اور پھر کسی کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

صبح ازل سے دل کو غمِ ہجرِ یار تھا ۔۔۔ مجھکو طلوعِ نشۂ ہستی خمار تھا
گردابِ بحرِ عشق کی تاثیر کیا کہوں ۔۔۔ ڈوبا تھا جو بھنور میں وہ دریا کے پار تھا
خوں ہو کے دل عبث غمِ دوری سے بہ گیا ۔۔۔ یہ آبلہ تو زیبِ کفِ پائے یار تھا
اس خالِ عنبریں نے بڑھایا جو داغِ دل ۔۔۔ کافور میرے زخم کا مشکِ تتار تھا
فریادِ جانِ زار شبِ ہجر کیا کہوں ۔۔۔ دل کو طپیدگی تھی جگر کو فشار تھا

آہ اپنے قافلے کی کچھ خبر پاتے نہیں ۔۔۔ ہم ہوں کے نقشِ پا کا ہم اثر پاتے نہیں

صدمۂ اندوہ سے شاید کلیجہ پھٹ گیا — آج ہم وہ لذتِ دردِ جگر پاتے نہیں
بادیہ ہی ہولناک اور منزلِ مقصود دور — کس سے جی بہلائیں کوئی ہمسفر پاتے نہیں
بیکسی اپنے شہیدِ ناز کی ہم سے نہ پوچھ — جس کے ماتم میں کسی کو نوحہ گر پاتے نہیں
کیا کوئی پھل پائے گا فریاد نخلِ عشق سے — جز گلِ داغِ جگر جس کا ثمر پاتے نہیں

اب حضرت الفت کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے۔

دل پیش کش ہی نذر ہی یہ جانِ زار بھی — لکھدیں مگر حضور مچلکہ نباہ کا
بیعت مجھے بھی مشربِ پیرِ مغاں میں ہو — ساقی ادھر بھی دورِ کرم کی نگاہ کا

آباد یہ میکش رہیں ساقی کا بھلا ہو — پھر قلقلِ مینا کی بلند آج صدا ہو
پھر زخم کہیں آج میرے دل کا ہرا ہو — قاتل دمِ شمشیر دمِ بادِ صبا ہو

اس پاکیزہ کلام سے لطف اندوز ہو کر ذرا دوسرا جام ہاتھوں میں لیجئے اور اس کا ذائقہ ملاحظہ کیجئے

حضرت میر انور علی انور فرماتے ہیں۔

اس فصلِ بہاری میں وہ گل ہم سے جدا ہو — اے گردشِ ایام زبوں تیرا برا ہو
ہر سمت سے ہو سایہ فگن یار کی صورت — آئینۂ خاطر میں اگر کچھ بھی جلا ہو
لائی نہ کبھی پیرہنِ یار کی خوشبو — اے بادِ صبا چل میرے آگے سے ہوا ہو

قطعہ

اڑتی سی خبر ہم قفسو! پائی ہی میں نے — معلوم نہیں کون رہے کون رہا ہو
پابندیِ الفت کا تقاضا ہی مگر یہ — صیاد اگر چھوڑ دے خود رشتہ بپا ہو

اس کے ساتھ اس عہد کے ایک اور نامور بزرگ منشی محمد علی خاں کا بھی کلام ملاحظہ ہو۔

اے ماہ جب آنکھوں میں تو ہی جلوہ نما ہو — پھر مردمِ دیدہ کی کہاں آنکھوں میں جا ہو
اس طرح میری پیاس بجھا اے مرے قاتل — آبِ دمِ شمشیر ہو اور میرا گلا ہو

"کس طرح دکھائے وہ کسی غیر کو صورت آئینہ نہ دیکھا کبھی جس نے، یہ حیا ہو

ادھر تو کشورِ دل لوٹتا ہے ترکِ نگاہ ادھر ہی لشکرِ مژگاں پرا جمائے ہوئے

اس عہد کے ایک دوسرے ہندو شاعر منشی گنگا لال صاحب داغ کے اشعار بھی سنئے اور داد دیجئے۔ یہ زبان کا کمال ہے کہ بہار کے باشندوں کی زبان بھی اس قدر صاف ہے اور ان کا کلام اس اعلیٰ پایہ کا ہے۔

تیری زلفوں سے اماں ہے کسے یار آج کی رات انھیں دو کالوں نے رکھا ہمیں مار آج کی رات

صاف ہو وصل میں عاشق سے کدورت کیسی میری جاں دور کرو دل سے غبار آج کی رات

دردِ دل سے جو کراہا تو وہ ہنسکر بولے جاں بلب کون ہے آوارہ دیار آج کی رات

وہ شبِ ماہ میں آتے ہیں جو افشاں چن کر چاندنی دوہری دکھاتی ہے بہار آج کی رات

گلشنِ حسن پر بہار نہیں کنگھی چوٹی نہیں سنگار نہیں

قتل کو بس ہے خنجرِ ابرو حاجتِ تیغِ آب دار نہیں

باغِ عالم میں گل کھلاتے کچھ اے جنوں موسمِ بہار نہیں

ایک ہی شکل کو دو کرکے دکھا دیتے ہیں جوہرِ آئینہ قاتل تری تلوار میں ہے

اللہ اللہ کیا کلام ہے۔ شعر ہے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں فصاحت و بلاغت منھ چومے لیتی ہے۔ بلند خیالی ہے کہ زمین پر قدم نہیں رکھتی صنائع و بدائع کا دریا بہ رہا ہے۔ اور زباندانی کہتے ہیں کس کو؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کلام کسی استادِ وقت سے کم ہے۔

اس دور کے دو حصے ہوئے ایک ناسخ و آتش سے ذوق و غالب تک اور دوسرا داغ و امیر سے آج اس وقت تک۔ اب ہمیں موجودہ زمانے کے شعرا کو دکھانا چاہیئے اس وقت یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ اس زمانے میں صوبہ بہار میں ایسے ایسے شعرا موجود ہیں جو صرف اس صوبے کے لئے باعثِ فخر و ناز نہیں بلکہ تمام ہندوستان ان پر فخر کرسکتا ہے آج ہندوستان کا کون سا بچہ ہے جو شاد، آزاد، اثر، احقر، رنجور مرحوم، کشش پھلواروی، حسرت، شہباز مرحوم۔ تمنا عماد پوری، اکبر دانا پوری، اور شوق نیموی وغیرہ وغیرہ سے واقف نہیں۔

ان کے کلام کا اگر انتخاب ہی کیا جائے تو دفتر کے دفتر ہو جائیں۔ حضرت شاد کے بارے میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ جس وقت شیخ عبد القادر اڈیٹر مخزن نے "اردو سبھا" کی تحریک کی تھی اس وقت حضرت شاد اس سبھا کے اندر بنائے گئے تھے ان کا کلام تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے ان کی تصانیف میں سے ذیل کی چیزیں نظر سے گزری ہیں:-

مرآۃ الخیال، ہیئۃ المقال، حلیۃ الکمال، تاریخ صوبۂ بہار، مثنوی نویدِ ہند، مثنوی فغانِ دل کش قدرِ کمال، نوائے وطن، مثنوی چشمۂ کوثر، مثنوی ثمرۂ زندگی، رسالہ یومیہ بزبان عربی، تذکرۃ الاسلاف مختلف قطعات، مراثی، قصائد اور غزلیں۔ مجھے بدقسمتی سے اب تک ان کا کوئی دیوان مرتب دیکھنا نصیب نہیں ہوا ہے، لیکن جتنی غزلیں اُن کی نظر سے گزری ہیں وہ ایک دیوان سے زیادہ ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے شعرائے وقت کا زمانہ پایا ہے اور محرّم میں خود اپنا مرثیہ بڑے آب و تاب سے پڑھتے تھے اور لوگوں سے داد لیتے تھے۔ رہے ہمارے آزاد، ان کے بارے میں میرے خیال میں مصنف خمخانۂ جاوید کی رائے کافی ہے۔

" حافظ فضل حق آزاد رئیس عظیم آباد، بانکے پور کے نامی گرامی شاعر ہیں گزشتہ زمانہ میں اخبار الپنچ بانکی پور میں ان کا کلام اکثر چھپا کرتا تھا۔ اُردو شاعری کے علاوہ فارسی میں بھی فصاحت و بلاغت کے ساتھ فکر سخن کرتے تھے۔ عربی میں اعلیٰ دستگاہ حاصل ہے .... معمولی فرسودہ خیالات سے آپ کی جدّت پسند طبیعت متنفر ہے آپ کی نظم میں اچھوتے نیچرل خیالات اکثر پائے جاتے ہیں اگرچہ کبھی کبھی بوجہ علمی معلومات و تبحر علمی، شوکت الفاظ زیادہ ہوتی ہے مگر نہ ایسی جو قابلِ گرفت ہو۔ آپ کی ذات مجمع کمالات ظاہری و باطنی ہے آپ کی کوئی نظم لطف سے خالی نہیں پائی جاتی بلکہ جدت خیال اور سلاست بیان اس پر مستزاد ہے اگر حضرت کے مشہور مضمون کا انتخاب ہی درج تذکرہ کیا جائے تو صدہا صفحے درکار ہوں"۔

حضرت اثر بھی ان دونوں بزرگوں سے کم نہیں ان کا اصلی نام شمس العلماء خان بہادر مولوی امداد امام صاحب ہے۔ مسٹر علی امام و حسن امام آپ کے لائق فرزند ہیں۔ آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے پرانے مشاق اور دیرینہ سخن سنج بزرگ ہیں۔ آپ نے نقد شاعری پر ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے جس میں تمام دنیا

کے شعرا کے کلام پر بحث کی ہے۔ اور یہ کتاب زبان اُردو کی کتب اولین میں ہے اس کتاب کا نام کاشف الحقائق معروف بہ بہارستانِ سخن ہے۔ جس میں آپ نے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا مصری، یونانی، لاطینی، اطالوی، جرمن، انگریزی، عربی، فارسی، اُردو، سنسکرت، بھاشا، چینی، جاپانی اور برما کی طرز شاعری پر ایک محققانہ دلچسپ بحث کی ہے آپ کی دوسری کتاب "کتاب الاثمار" ہے اس کا زبان سوئڈن میں ترجمہ ہو چکا ہے اور وہاں کی یونیورسٹی میں پڑھائی جا رہی ہے۔ مرأۃ الحکماء بھی آپ کی تصنیف ہے۔

جناب حاجی بشارت حسین صاحب احقر اس وقت قصبہ بہار کے سب سے پرانے اور پر گو شاعر ہیں ان کے کلام کی مقبولیت کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے صوبۂ بہار کے اکثر قوالوں سے آپ کے غزلوں کی فرمائش کی جاتی ہے اس مضمون کے واسطہ سے خاکسار کو بھی جناب سے نیاز حاصل ہوا آپ کا کلام چھپ چکا ہے دو تین مثنویاں ایک واسوخت اور لاتعداد غزلیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اب بحکم سرکاری واقعۂ کان پور کے بعد سے کچھ نہیں کہتے پہلے مختلف رسائل میں آپ کا کلام نظر آتا تھا۔ شمس العلماء مولانا محمد یوسف صاحب رنجور سے کون اخبار بین شخص ہوگا جو ناواقف ہوگا۔ آپ النیچ بانکی پور میں برابر مضامین لکھا کرتے تھے کلکتہ میں سررشتہ تعلیم کے اعلیٰ عہدہ پر مامور تھے۔

مولانا عبدالغفور شہباز صوبۂ بہار کے وہ مایۂ ناز شاعر و ادیب ہیں جن پر صوبہ بہار جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو اگر دنیا میں کسی نے زندہ کیا تو وہ ہمارا شہباز تھا ان کی حیات زندگی پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اور ان کا جملہ کلام مولانا ہی نے بڑی کوششوں کے بعد ترتیب دے کر نول کشور کے مطبع سے شائع فرمایا یہ آپ ہی کی سعی بلیغ کا ثمرہ ہے کہ نظیر "شکسپیر ہند" کہے جاتے ہیں ورنہ کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اُن کی رباعیات مشہور ہیں۔

مولوی عبدالجلیل صاحب نظر دلسنوی کا زمانہ اب سے چالیس برس قبل تھا آپ کو فارسی و عربی میں کمال تھا۔ اُردو کے اُستاد وقت تھے۔ مظفر پور میں حکمت کرتے تھے۔ آپ کی مثنوی گلزار جلیل مسدس اتالیق تہذیب الالفاظ اور داستان بے عدیل شائع ہو چکی ہیں۔ آخر میں آپ نے ایک داستان چالیس ٹھگوں کی لکھنی شروع کی تھی لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا اور اس کو ناتمام چھوڑ گئے اس کی تین قلمی جلدیں دلسنہ الاصلاح لائبریری

ہیں موجود ہیں۔

اس عہد کے نوجوان شعرا میں بھی بعض ایسے ہیں جو آگے چل کر اپنے وقت کے غالب و مومن اور ناسخ و آتش ہونگے۔ ان میں قابلِ ذکر مسٹر فہیم الدین حسرت، مولوی نجم الہدیٰ صاحب نجم، مولوی ابو ظفر صاحب واقف بہاری، مولوی بشیر الحق صاحب بیدل دسینوی، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی قبلہ دسینوی، مولوی ابوالحسنات صاحب نیر ندوی ہیں۔ اللہ ان کو نظرِ بد سے بچائے آمین۔

اگر ہم صرف موجودہ شاعروں کا تذکرہ کریں تو اس کے لئے مستقل ایک کتاب کی ضرورت ہے اس وقت صرف بانکی پور میں ۴ یا ۵ سو سے زائد شاعر موجود ہونگے اس سے آپ پورے صوبے کی تعداد کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

نثر

نظم کے بعد نثر کا درجہ ہے اور اس کا دامن اس قدر فراخ ہے کہ جملہ علوم و فنون کے پھول اس میں جمع ہیں اُردو نثر کو تاریخی دَور میں لگا کر دیکھوگے تو پتا چلے گا کہ اس کی ابتدا جان گلکرسٹ صاحب کے عہد سے ہوئی تھی جس طرح فارسی کو ٹوڈر مل نے دفتروں میں داخل کر کے مسلمانوں پر ایک احسان عظیم کیا اسی طرح ایک انگریز نے نثر کی بنیاد ڈال کر اور اسی میں تراجم و تالیفات کا سلسلہ قائم کر کے اُردو پر وہ احسان کیا ہے جس سے وہ تاقیامت سبک دوش نہیں ہو سکتی اور زبان اُردو ہمیشہ اس بار سے دبی رہیگی۔

ہر زبان میں جب کبھی علمی زبان کی ابتدا ہوئی ہے وہ تراجم سے ہوئی ہے اور کافی سرمایہ کے اجتماع کے بعد پھر اپنا کاروبار شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اُردو کی تالیفات کا آغاز ہوا یہی راستہ اس کے سامنے کھلا ہوا تھا اور سالک اُردو اسی صراطِ مستقیم پر گام زن بھی ہوا۔ جس زمانہ میں جان گلکرسٹ صاحب نے یہ کام شروع کیا اس وقت "بلدۂ کلکتہ" بھی نشیان ایسٹ انڈیا کمپنی کے وجہ سے ایک ادبی جگہ ہو گئی تھی اور ہر نووارد انگریز جو ہندوستان میں قدم رکھتا تھا اُسے یہاں کی مروجہ زبان اُردو سیکھنی پڑتی تھی لیکن اس وقت تک نثر کی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ صاحب موصوف نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور بکمال جگر سوزی و ہمدردی سے اس کا سلسلہ قائم کیا اور فورٹ ولیم کلکتہ میں ایک محکمہ خاص اسی غرض سے کھولا منشی مرزا علی لطف،

میر امن، سید محمد منیر، سید بشیر علی افسوس، مداری لال گجراتی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں ہندو بھاری ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی علمی چیز کا شوق دلانا ہو تو طالب علم کو ابتداءً ریاضی وفلاسفی کے نکتے نہیں سمجھائے جاتے ہیں بلکہ میٹھی میٹھی باتوں سے اس کو شوق دلایا جاتا ہے اور جب وہ مانوس ہو جاتا ہے تو پھر اس کو علمی دنیا کی سیر کرائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ جوان طبیعتوں میں محبّت والفت راز و نیاز، جوانی و مئے ارغوانی، وصل و ہجر، حسن و عشق کی طرف میل ہوتا ہے اس لئے اُنھوں نے اسی قسم کے قصّے تالیف کروائے۔ باغ و بہار، طوطا نامہ نثر بے نظیر وغیرہ اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ دوسری دنیا دیدہ جماعت ہے جس میں معمر بزرگ شامل ہیں اور انھیں مذہب سے زیادہ تعلق ہے اس لئے ان کے لئے مذہبی کتابیں تالیف کرائیں۔ دوسری ایک جماعت ان انگریزوں کی تھی جنھوں نے یہاں پہونچکر ہندوستانی زبان سیکھنی چاہی ان کے لئے قواعد لکھائے خود بھی لکھے دوسرے انگریزوں کی لکھی ہوئی تصنیفیں شائع کرائیں ان کے ساتھ ایک دوسرے انگریز جان شکسپیر کا نام لکھنا بھی بہت ضروری ہے اُنھوں نے بھی اُردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ اب ہمیں زبان کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے پہلے پہل اُردو کی تالیف تو کیا خط و کتابت بھی موجود نہ تھی اور تمام لوگ فارسی ہی میں خط لکھتے تھے، حتّٰی کہ ۵۰ برس قبل کے جس قدر خطوط میری نظر سے گزرے اس میں ۹۹ فی صدی فارسی میں لکھے ہوئے تھے اور اب تک بہت سے ایسے بزرگ دلّی میں موجود ہیں جن کو فارسی میں کہئے تو صفحے کے صفحے رنگین عبارت سے بھر دیں لیکن وہ اُردو ایک صفحہ بھی پوری طرح نہیں لکھ سکتے اور اگر لکھیں تو وہی فارسی کا ترجمہ کہ "انتظار کھینچتا ہوں" وغیرہ الفاظ ملیں گے۔

لیکن اس پچاس برس کے عرصہ میں بہار نے اس قدر جلد ترقی کی کہ غالب کے خطوط کا اثر فوراً محسوس ہونے لگا اور اب تو یہ حال ہے کہ فارسی میں صحیح دو سطریں لکھنے والا مشکل سے ملتا ہے۔ سب سے پہلا نقش جو اُردو کا مانا گیا ہے وہ باغ و بہار کا ہے۔ اس میں فارسیت غالب ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں جس قسم کی فارسی تھی بالکل اسی طرز پر وہ کتاب لکھی گئی ہے اور ترکیبیں بھی وہی ہیں اس کی دو ایک سطریں ملاحظہ ہوں:۔

"سبحان اللہ کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مُٹھی خاک سے کیا کیا صورتیں اور مٹی کی مورتیں پیدا کیں آسمان اس کی دریائے وحدت کا ایک بُلبُلہ ہے اور زمین پانی کا بتاسہ۔"

اس عہد میں اُردو کے ایسے نثار پیدا ہوگئے تھے جو اس قسم کی عبارت ضرور لکھ لیتے تھے۔ مولوی حفیظ الدین عہد نے اسی زمانے میں جان گلکرسٹ صاحب کی فرمائش سے خرد افروز تالیف کی اس کی زبان بھی ملاحظہ ہو:۔

"تسلی بخشی۔ سچ کہ یہ نسخہ اندھوں کی آنکھ میناؤں کے آنکھوں کی پتلی ہے آگے یہ فارسی کی آنکھوں کا کحل الجواہر تھا اب ہندیوں کی نظروں میں بھی سہیل یمن ہوا۔ اُمید ہے کہ بعد میرے یہ یادگار زمانہ کے صفحہ پر باقی رہے گا۔"

اس کے بعد دوسرا دَور رجب علی سرور وغیرہ کا زمانہ ہے اس عہد میں مولوی عبد الجلیل صاحب نظر دیسنوی مولوی محمد عبد الحق انجم وغیرہ ہیں۔ مولوی عبد الحق صاحب کا طرزِ تحریر ملاحظہ ہو:۔

"جب یہ مسافر بعد طے مراحل بحر و بر و برداشتگی شدائد سفر مینو سواد عظیم آباد میں آیا صانع مطلق نے عجیب صنعت گری کا نقشہ دکھایا، دیکھا کہ مکانوں کی رفعت ہم پہلوئے لامکاں ہے آبادی ویرانی کی بالیاں ہیں، راہیں طریق کامیابی کی سبیل۔ کوچہ صاف رہبری کی دلیل۔"

اس کے بعد مطابع کی ارزانی و کثرت نے اس قدر مصنف بنا دیئے کہ بقول شخصے جس کے پاس چند پیسے ہوئے ایک کتاب اپنے نام سے لکھ مصنفین کے زمرۂ مقدس میں جا ملا۔ لیکن اس میں خاص قابل ذکر فخر بہار حضرت شاد مولوی امداد امام صاحب اثر، شوق، سید سلیمان صاحب ندوی دیسنوی، مولوی عبد الغنی صاحب استھانوی مرحوم۔ اکبر دانا پوری مرحوم وغیرہ ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

ہم جیسا کہ اوپر بیان کر آئے ہیں کہ نثر کے دامن میں گلہائے رنگارنگ ہیں اور جو اس چمن کی سیر کرنے جاتا ہے پریشان ہو جاتا ہے کہ جس کی طرف نظر کیجئے ہر پھول دامن نظر کو کھینچتا ہے اور بیچارہ پریشان ہو کر کہہ اٹھتا ہے

دامانِ نگہ تنگ گُل حسنِ تو بسیار
گلچین بہارِ تو زداماں گلہ دارد

اس لئے میں دکھاؤں گا کہ ہر ہر موضوع مثلاً قاعدہ، ادب، نثر، تاریخ، فلسفہ و منطق، اصول و قواعد، مذہبی تصنیفات قصص وغیرہ میں کون کون سی کتابیں ہمارے صوبۂ بہار کے خزانہ میں ہیں اور ان کی کیا قدر و قیمت ہے۔

"ادب نثر"

اس ضمن میں سب سے پہلے آتش زبان، سراجِ ہندوستان بلیغ اللسان حضرت شاد کا نام ہے۔ نوائے وطن لکھ کر صوبۂ بہار بلکہ ہندوستان پر وہ احسان کیا جو آبِ حیات نے اردو پر کیا۔ اگر یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو شائد بہار کے دو چار شعرا کے سوا پتا نہ چلتا۔ اور دوسری چیز اس میں زباندانی پر بحث ہے۔ المختصر کتاب نثر کے لئے باعثِ صد ناز ہے۔

دوسرا نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہمارے ہمسائے مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم ہیں آپ کی ذات جامع جملہ صفات تھی آپنے اردو کی بڑی خدمت کی ہے زمانہ تک اپنچ بانکی پور میں اڈیٹری کرتے تھے۔ پھر حیدرآباد گئے لیکن وہاں بھی علمی شغل برابر جاری رہا اور مرتے دم تک قلم ہاتھ سے نہ رکھا حتی کہ ان کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کی "فتح اندلس" الناظر پریس سے شائع ہوئی ہے۔ ادب نثر میں ان کی تصنیف یوذاسف وبلوہر ہے یہ کتاب مہاتما بدھ کے زمانے کے علمی کمالات کا مجموعہ ہے اور اُس عہد کی ادبی خوبیاں اُس کے نکات، شاعرانہ خیالات وغیرہ پر متین اور عالمانہ بحث ہے اس کتاب نے بہت زیادہ سنسکرت کے خیالات کو اردو کا لباس پہنا کر قوم کے سامنے پیش کر دیا ہے اور ایک بہت قابل قدر اضافہ ہے۔

آپ کی دوسری کتاب "تحفۂ عماد" ہے ادبی حیثیت سے یہ اس لئے وقعت رکھتی ہے کہ جس طرح یوذاسف وبلوہر سنسکرت کا ذخیرہ اردو میں لایا اسی طرح آپ نے عربی کے جواہر سے ہمارے دامن بھر دیئے۔ تیسرے بزرگ مشہور ادیب مولوی شمس العلما حکیم امداد امام صاحب اثر ہیں۔ آپ کی مشہور و معروف تصنیف کاشف الحقائق یا بہارستانِ سخن ادبی دنیا کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے اور تمام اردو پبلک کو حضرت کا ممنونِ احسان ہونا چاہیئے کہ آپ نے اُس کے ذریعے سے ان تمام طالبانِ علم کو گھر بیٹھے آب حیات پلا دیا اس میں فن شاعری پر بحث کی گئی ہے اور نہایت ہی لطیف پیرایہ میں دنیا کی جس قدر زبانیں ہیں اُن کے شاعرانہ خیالات درج کئے گئے ہیں اور اُن پر ناقدانہ بحث کی ہے۔ آدمی صرف اُسی کو پڑھکر تمام دنیا کے شاعرانہ خیالات کو معلوم کر سکتا ہے دریا ہے کہ کوزہ میں ہے۔

اس کے علاوہ سیکڑوں کتابیں ہیں جو مضمون کی طوالت کی وجہ سے نظرانداز کی جاتی ہیں۔

مذہب

مذہب کو مولویوں نے اپنی منطق و حرص سے اور موجودہ دنیا نے بے توجہی سے اس قدر خشک بنادیا ہے کہ مذہب کا نام آیا اور خشکی کا یہ اثر ہوا کہ خون خشک۔ چنانچہ مذہبی تصنیفات کے لئے یہ مخصوص بات ہوگئی ہے کہ مذہبی کتابیں عموماً مزیدار نہیں ہوتیں۔ لیکن اس کو کوئی کیا کرے مذہبی کتابیں بہت لکھی جاتی ہیں اور کثرت سے چھپتی ہیں۔ راہ نجات وغیرہ جیسی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال چھپتی ہیں اس لئے ان کی صرف فہرست دیدی جائیگی۔ لیکن ہمیں حال کی ایک تصنیف پر خاص طور پر توجہ آپ کو دلانی ہے یعنی جناب مولوی علی حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر بہار کی تفسیر مطالب القرآن۔ اس نئے دور میں ایک گریجوایٹ کا تفسیر لکھنا پہلا کام ہے۔ تفسیر نہایت جامع ہے اور کمال یہ ہے اس میں تمام مسئلوں کی جدا جدا سُرخیاں قائم کرکے تمام کلام مجید سے اخذ کرکے اس کو مسلسل بنادیا ہے اور عہد موجودہ کے خیالات رائج کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ مفید معلوم ہوتی ہے زبان کے لحاظ سے بھی کم وقعت نہیں۔

مولانا محمد ظہیر احسن صاحب محدث شوق	(۱) جلالین فی رفع الیدین
〃 〃 〃	(۲) اوشحتہ الجید
مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری	(۱) مواعظ
〃 〃 〃 〃	(۲) مکتوبات دو جلد (تصوف کی تعلیم بذریعہ مراسلت)
مسٹر نصیر الدین حسین بیرسٹر	(۱) ذکر النبی
حافظ محبت الحق صاحب (شمس العلماء)	(۱) میلاد النبی
〃 〃 〃 〃	(۲) رسالہ ربا
〃 〃 〃 〃	(۳) پردہ سسٹم

(۴) دعوۃ الحق

(۵) شرعۃ الحق

مولانا حسن میاں پھلواری

(۱) سیرۃ النبی

(۲) تذکرۃ ابو الحبیب سہروردی

(۳) خلف حسن

مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم

(۱) صیانۃ الایمان تنقیح حقوق نسوان

(۲) تقلید و عمل بالحدیث

حافظ تجمل حسین صاحب دسنوی

(۱) ذکرِ میلاد مولدِ ابی القاسم

(۲) فضلِ رحمان

شیخ شجاعت علی صاحب

(۱) حکمۃ التوحید

حکیم محمد احسن

(۱) خواص القرآن

مکتوباتِ سہ صدی جناب حضور مخدوم صاحب اور سیکڑوں مذہبی کتابوں کی فہرست میرے سامنے موجود ہے لیکن طوالت کے خوف سے اس کو اسی پر ختم کرتا ہوں۔

تاریخ

تاریخ بہار کی خاص چیز ہے۔ عہد گپتا یا موریا کے پہلے ہی سے یہاں سلسلہ چلا آتا ہے اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا عہدِ اسلام میں ہندو مورخین کی تاریخیں مسلم الثبوت ہیں چنانچہ آج کل Journal of Behar + Orissa Research Society میں مہاراجہ شتاب رائے کی لکھی ہوئی تاریخ کا ترجمہ نواب سرفراز حسین خاں کے قلم سے شائع ہو رہا ہے۔

تاریخ میں ذیل کے بزرگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

خان بہادر مولانا علی محمد، خان بہادر شاد۔ آپ کی دو کتابیں یعنی تاریخ صوبۂ بہار اور تذکرۃ الاسلاف

ہیں، یہ کتابیں لکھ کر آپ نے ایک اہم فرض کو ادا کردیا ورنہ اگر اس وقت کوئی قافلۂ رفتہ کے نقشِ پا بھی تلاش کرتا تو نہ پاتا۔

دوسرے بزرگ حضرت اکبر دانا پوری ہیں آپ نے اسلامی تاریخ کو دو جلدوں میں تصنیف فرمایا ہے اور اس کا نام اشرف التواریخ رکھا اس میں حضرت آدمؑ سے رسول مقبولؐ اور آپ کے اصحاب تک کا تذکرہ شامل ہے۔ بہت جامع کتاب ہے قصص الانبیا وغیرہ سے بہت زیادہ قابل اعتماد ہے۔

تیسرے بزرگ ہمارے دیرینہ بزرگ جناب مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم ہیں آپ کی ایک تاریخی تصنیف جو آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے اس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ تاریخ میں آپ کی کتاب نعمت عظمیٰ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب علامہ عبدالوہاب شعرانی کی طبقات الکبریٰ کا ترجمہ ہے یہ کتاب اسماء الرجال کی ہے اور اردو کے لئے ایک قیمتی گوہر ہے۔

مولانا موصوف کی ایک چھوٹی کتاب گیندھریا دائی بھی ہے اس میں آپ نے ایک سچی مذہبی وفا شعار باعصمت خادمہ کے حالاتِ زندگی تحریر فرمائے ہیں جو آپ کی بستی کی باشندہ تھی اور ہماری بہاری بہنوں کے لئے باعث عبرت و شرم ہے۔

آپ کے علاوہ بہت مورخین اور گزرے ہیں لیکن اس وقت اگر صوبۂ بہار کسی فرد پر علمی حیثیت سے فخر کرسکتا ہے اور اس کو ناز ہو سکتا ہے تو وہ خاک دلسینہ کا نونہال سید سلیمان صاحب ندوی ہیں اور آپ شاعر ہیں آپ کا کلام معارف وغیرہ میں چھپتا ہے۔ مذہبی حیثیت سے بھی آپ کا پایہ بلند ہے۔ حال میں آپ نے دو رسالے (۱) السنت والجماعت (۲) اسلام و فوٹوگرافی لکھے ہیں۔ لیکن آپ کا اصلی میدان وہی ہے جو آپ کے اُستادِ محترم علامۂ شبلی نعمانی کا تھا حال میں جناب کی کتاب ارض القرآن شائع ہوئی ہے یہ کتاب دس برس کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کی قدر و قیمت سمجھنے کے لئے صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ اس موضوع پر آج تک ہماری کسی زبان میں اس قدر جامع مستند مدلل و دلچسپ کتاب نہیں لکھی گئی۔ مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے دلگداز میں اس پر ریویو لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ مولانا اس تصنیف میں اکثر حیثیتوں سے اپنے استاد سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔

آپ کی دوسری تصنیف سیرۃ عائشہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ آپ کی تصنیف ایک چھوٹا سا رسالہ اسلامی خواتین کی بہادری بھی ہے (Philology) علم الالسنہ میں بھی آپ کو کمال ہے اور لغاتِ جدیدہ اس فن میں تصنیف ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرۃ کی تکمیل آپ ہی فرما رہے ہیں جو اس وقت اسلامی دنیا کا اہم ترین علمی فرض ہے اور علامہ کی عبارت کے بیچ میں جہاں جہاں بضرورت اضافہ کیا گیا ہے اگر علامتِ اضافہ نہ ہو تو پتا بھی نہیں چل سکتا۔ غرض کہ

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مولانا شبلی کی زبان مستند ہے اور اس پر سید سلیمان کا تصنیف و تالیف میں یہ کمال پھر کون کہہ سکتا ہے کہ زبان دانی میں صوبۂ بہار کسی صوبہ سے کم رہا۔

فلسفہ و منطق

فلسفہ و منطق میں بھی اُردو میں بہت کم تصنیفات ہوئیں ان میں دو تین بہاریوں کی بھی تھیں۔ المنطق مصنفہ مولوی حکیم رکن الدین دانا، التصور والتصدیق مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم دلسینوی۔

(الف) نباتات

اس میں مولانا امداد امام اثر کی کتاب خاص کر قابلِ ذکر ہے اس کا نام کتاب الاثمار ہے اور جیسا کہ آگے بیان کیا جا چکا ہے کہ ناروے اور سوئڈن کی یونیورسٹیوں میں اس کا ترجمہ ہو کر داخلِ نصاب کر دیا گیا ہے۔ ایک دوسری قابلِ ذکر کتاب کاشتکاری مصنفہ مولوی احسن خاں باڑہ ہے۔

(ب) طبیعیات

مولوی راحت حسین صاحب بی اے وکیل بھاگلپور اس معاملہ میں ہم لوگوں کے شکریہ کے مستحق ہیں انھوں نے یہ سلسلہ جاری کیا ہے جس سے اہم علمی مباحث آسانی سے اُردو دان پبلک کے سامنے آتے جاتے

ہیں۔ آپ نے ایک رسالہ القمر تحریر فرمایا ہے وہ زبان و مباحث و ترتیب کے لحاظ سے قابل قدر ہے اور اسی قدردانی کے خیال سے انجمن ترقی اُردو نے نہایت آب و تاب سے شائع کیا ہے اس سلسلہ کی دوسری کڑی النحل ہے اس کو مخزن نے بہت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ شہد کی مکھی کی پوری تاریخ اس کے عادات فطرت طرز معاشرت، کاروبار۔ امتیاز درجہ وغیرہ پر پوری بحث ہے اور مزیدار بحث ہے۔

قصص و حکایات

اس سُرخی میں بھی ہمیں سب سے پہلے اپنے پیارے شاد ہی کا نام لینا پڑتا ہے آپ نے صورۃ الخیال ایک قصہ تین جلدوں میں لکھا ہے نہایت دردناک ناول ہے مجال نہیں کہ آپ پڑھیں اور آپ کا دامن تر نہ ہو جائے۔ اس میں یہ دکھایا ہے کہ اگر شریف عورت پر مصیبت آجائے تو وہ کس طرح اس کو نباہ سکتی ہے۔

دوسرے بزرگ مولانا بے عدیل حکیم عبدالجلیل صاحب نظر دلیسنوی ہیں آپ کا قصہ چالیس ٹھگ غیر مطبوعہ ہے۔ مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تین جلدیں دلیسنہ لائبریری میں موجود ہیں۔ تیسرے قابل ذکر بزرگ مولوی سید افضل الدین احمد خاں صاحب بارٹہ ہیں آپ نے فسانہ خورشیدی لکھا ہے زبان اتنی ستھری کہ لکھنؤ و دلی والے شرما جائیں اور بس۔ (Love's Labour Lost)

حال کے مصنفین میں مولوی سجاد مصنفہ محل خانہ اور مسٹر سلیمان بیرسٹر مترجم قابل ذکر ہیں۔

تذکرہ نویسی

اس میں ہمارا پہلا ہیرو شہباز ہے مولانا عبدالغفور نے نظیر اکبرآبادی کو نظیر بنا دیا ورنہ اس بیچارے سے کوئی واقف بھی نہ ہوتا یہ تین چار سو صفحوں پر مشتمل ہے اور نہایت عالمانہ طریقہ پر لکھا گیا ہے۔ زبان کی حیثیت سے بھی بے نظیر ہے۔

دوسرے تذکرہ کا نام "تذکرہ شعراء پٹنہ" ہے اس میں عہد قدیم کے اکثر شاعروں کے حالات درج ہیں۔

تیسرا تذکرہ گلزار ابراہیمی ہی یہ علی ابراہیم خاں علی کا لکھا ہوا ہی اور قدامت کے لحاظ سے اولیت کا درجہ رکھتا ہی گلشن ہند اسی کا نقش ثانی ہی۔

یہاں تک ہم نے یہ دکھایا کہ زباں دانی اور علمی ترقی میں صوبۂ بہار کسی طرح دوسرے صوبوں سے کم نہیں رہا اور زبان کی ترقی جن اشیاء پر منحصر ہی ان چیزوں کا اس اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہونا دلیل اس بات کی ہی کہ زبان نے یہاں اپنا پورا پورا حق پا یا لیکن صرف مستقل کتابیں لکھ دینا ہی ایک زبان کے لئے کافی نہیں ہی اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اُردو زبان کی ترقی میں اس صوبے نے اور کیا حصہ لیا۔

آج کل مہذب ممالک میں کسی چیز کی ترقی و اشاعت کے ذرائع تین ہیں انعقاد انجمن، اخبارات کی اشاعت اور رسالجات کا اجرا اور کام کرنے والوں کی ہمت افزائی اِن تینوں ذریعوں سے اپنے مقصد کو کامیاب بنایا جاتا ہی۔ اُردو کی ترقی کے ان تینوں طریقوں میں بھی بہار نے برابر کا حصہ لیا اس لئے اب ہم اس میں سے ہر ایک پر جداگانہ روشنی ڈالتے ہیں۔

مسلمانوں کی جب سلطنت تھی اس وقت ہر شخص اپنے کو حاکم وقت کا سچا مددگار و وفادار سلطنت سمجھتا اور جس ملک کی بہبود کے لئے جس چیز کی ضرورت دیکھتا تھا فوراً بلا انتظار اُس ضروری کام کو شروع کر دیتا تھا۔ چنانچہ تعلیم کی ضرورت کو کون تسلیم نہیں کرتا اس کو دیکھئے تو معمولی سے معمولی آدمی کے ہاں بھی مکتب کھلا ہوا ہی دس بیس لڑکے پڑھ رہے ہیں امرا کا تو کیا کہنا ان کے ہاں سیکڑوں لڑکے برابر رہتے تھے وہ ہر طرح ان کی کفالت کرتے تھے اس لئے اس وقت کے لحاظ سے جب کہ قومی جلسوں کی قدر سے ہندوستانی ناواقف تھے اپنے ہاں مشاعرہ کرتے تھے۔ یہ ایک قسم کا علمی جلسہ ہوتا تھا جس میں تمام علماء وقت و فضلاء مقامی و بیرونی شریک ہوتے تھے اور شعرا کو ان کے کلام کے موافق انعامات ملتے تھے۔ یہ دکھینا ہو تو آب حیات اس سے بھری پڑی ہی لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا اور کانگرس، ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسری انجمنیں قائم ہو چکی تھیں ندوہ کی بنیاد بھی چند سال کے بعد قائم ہو گئی اور حشرات الارض کی طرح سیکڑوں انجمنیں ملک میں ہو گئیں اب لوگوں کو اس کی قدر و قیمت معلوم ہوئی اور اس کا شوق چرایا ہمارے صوبے میں بھی سیکڑوں انجمنیں قائم ہوئیں زبان کے لئے بھی مختلف انجمنیں ہر ہر شہر میں قائم ہوئیں اس میں انجمن مؤید اللسان عظیم آباد، انجمن خادم زبان گیا، انجمن

اخوان الصفا مونگیر، انجمن تہذیب آرہ، انجمن رحمتی پٹنہ، انجمن الاصلاح دیسنہ، انجمن الفلاح استھانوان وغیرہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں لیکن رفتارِ زمانہ نے ان کو بالکل مٹا دیا اور اب صرف ایک انجمن الاصلاح دیسنہ باقی ہے اس انجمن نے جو حیرت انگیز کام کیا ہے وہ شائد ہندوستان کی کسی بستی بلکہ شہر نے آج تک نہ کیا ہوگا اور اس کی ترقی کے لئے اس نے ۱۸۹۹ء میں ایک کتب خانہ کی نبیاد ڈالی۔ ۱۹۰۹ء میں اُردو تعلیم کے لئے مدرسہ جاری کیا اور اس وقت ۱۹۲۱ء میں اس کے کتب خانہ میں اُردو کی تمام کتابیں موجود ہیں۔ ہندوستان کے اکثر روزانہ اخبار و ہفتہ وار اخبار آتے ہیں اور رسائل تقریباً تمام ہی آتے ہیں اس وقت اُردو کتابوں کی تعداد پانچ ہزار سے متجاوز ہے آج تک جتنے اُردو کے رسائل شائع ہوئے ہیں سب کی مکمل جلدیں اول سے آخر تک یہاں موجود ہیں جو شائد ہندوستان میں کہیں نہ ملیں اور دُور دُور سے ان کے لئے لوگ آتے ہیں تحریر و تقریر کی ترقی کے لئے انجمن جلسے کرتی ہے اور لوگوں کو انعام دلاتی ہے چنانچہ اس کا اعلان اخبار اکسپرس وغیرہ میں نظر سے گزرا ہوگا۔

سُننے میں آیا ہے کہ موضع استھانوان جو ان اطراف میں علمی حیثیت سے ایک مشہور بستی تھی وہاں کے نوجوانوں نے پھر الفلاح اور اس کے کتب خانہ کی تجدید کی ہے اللہ اس کو حیات خضری و عمر جاودانی اور کارکنوں کو استقلال عطا فرمائے۔

لیکن جہاں پُرانی انجمنیں ٹوٹ گئیں نئی اُن سے زیادہ قائم ہوگئیں چنانچہ انجمن ترقی اُردو کی سالانہ رپورٹ دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ تقریباً ہر بڑے قصبہ میں اس کی شاخ اس قسم کی قائم ہوگئی ہے۔

دوسری چیز اجراء اخبارات و رسائل ہے اخباروں میں اَلپنچ نے زمانۂ دراز تک زبان اُردو کی خدمت کی ہے۔ اس کے تمام نامہ نگار تقریباً بہاری تھے اور اُس وقت اُردو میں اودھ پنچ لکھنؤ سے حضرت سجاد کے اڈیٹری میں بڑی زوروں پر نکلتا تھا اور دونوں میں اکثر معاصرانہ چشمکیں ہوتی تھیں لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک زبان کی غلطی بھی نکال سکے اِس کے نامہ نگاروں میں حضرت آزاد، رنجور، وحشت، خیر (گرو گھنٹال) حافظ (حافظ محب الحق صاحب) شہباز، ابوالمجدد (مولوی حنیف صاحب دیسنوی) نام کے حکیم (مولوی عبدالحکیم دیسنوی) اکبر داناپوری، احقر مظفرپوری، ابوالظرفا (مولوی مصاحب حسین صاحب) وغیرہ وغیرہ

تھے۔ یہ اخبار تقریباً نصف صدی کے قریب تک نکلتا رہا۔

اس کے کئی اڈیٹر ہوئے لیکن سب کے سب صوبہ بہار کے تھے مولوی رحیم الدین صاحب مرحوم بانی و اڈیٹر اخبار اور اُن کے بھتیجے مولوی محمد احسن مرحوم اڈیٹر بہار کے ایک موضع کے باشندے تھے دوسرا اخبار بہار پنچ گیا سے نکلا۔

(۳) شہرۂ آفاق پٹنہ (۴) تاج پٹنہ (۵) مشیر بہار پٹنہ (۶) المدبر پٹنہ
(۷) آرہ گزٹ آرہ (۸) پٹنہ اخبار پٹنہ (۹) اتحاد بہار (۱۰) الشرف بہار

وغیرہ وغیرہ اخبارات نکلتے تھے۔

رسائل میں قابلِ ذکر حسب ذیل ہیں:۔

(۱) نورِ ایمان پٹنہ

(۲) الہادی، انجمن اسلامیہ بانکی پور کے عروج کے زمانہ میں انجمن کی طرف سے شائع ہوتا تھا۔

(۳) رفتارِ زمانہ، پٹنہ۔ سرفراز حسین خاں صاحب کی طرف سے نکلتا تھا۔

(۴) بزم سخن ندرہ

(۵) بہار پٹنہ۔

یہ آخری رسالہ اُس وقت نکالا گیا تھا جب کہ ہندوستان میں طرحی رسالے حشرات الارض سے زیادہ ہو گئے تھے۔ ایک لکھنؤ سے ۶۔۷ رسالے نکلتے تھے۔ نغمۂ عندلیب، خیالِ یار، گلچیں، پیام یار، شعلۂ عشق، عطر فتنہ، ریاضِ سخن، انتخاب، کشتۂ ناز، زبانِ دہلی، عروجِ بہار، تحفۂ بمبئی، زبان، محبوب القوم، جلوۂ محبوب، اصلاح وغیرہ وغیرہ بیسوں گلدستے بازاروں میں آنے لگے تھے لیکن جو شان بہار کی تھی اور جیسے شاعر بہار نے پائے تھے کسی کو نہ نصیب ہوئے۔ اس میں سیکڑوں غزلیں ہوتی تھیں لیکن آج تک کسی نے کسی کے شعر پر بھی تو اعتراض نہیں کیا۔ اب زبان دانی اور اس کی ترقی کی شرکت میں کس کو ذرا بھی شک ہو سکتا ہے۔

تیسری صورت یہ تھی کہ اہل علم کی قدر دانی کی جائے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ایک نہیں سیکڑوں

اہل لکھنؤ اور اہل دلّی کی پرورش یہیں ہوئی ہے اور اب تک ہوتی ہے اور جو لوگ صاحب عزت ہیں اور انھوں نے شاعری کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا ہے ان کی قدر اور ان کا احترام اُسی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ حضرت اشرف علی فغاں جب دلّی سے برگشتہ خاطر ہوئے تو لکھنؤ آئے، نواب شجاعت الدولہ کے یہاں نوکر ہوئے لیکن دیوان نے تنخواہ نہ دی فوراً اس کی ہجو لکھی اور روانہ ہو گئے اس کا مطلع یہ ہے۔

اللہ می دہد و شیطاں نمی دہد نواب می دہد و دیواں نمی دہد

اب ان کے سامنے صرف عظیم آباد کا خیال تھا یہاں آئے جوہر قابل تھے شتاب رائے نے دربار میں رکھا اور یہیں خاک کے پیوند ہوئے۔ میر باقر نام دہلوی بھی جب پریشان ہو گئے تو عظیم آباد آئے اور تا زندگی نواب سید احمد خاں صولت جنگ کے رفیق رہے۔

ان کے علاوہ لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو انیس و دبیر ہر سال محرم میں مرثیہ پڑھنے یہیں آتے تھے اور سیکڑوں ساتھ لاتے تھے اور آج تک ان کی اولاد آتی ہے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور ذوق و شوق سے کلام سُنتے ہیں۔

حضرت داغ کو بھی کلکتہ جاتے ہوئے لوگوں نے اصرار سے روک لیا اور اپنی مرصع غزل وہیں کے مشاعرہ میں پڑھی جس کا مطلع ہے:۔

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں کسی سے آج بگڑی ہے جو یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

قیام عظیم آباد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مقطع میں فرماتے ہیں۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

میر امن دہلوی مصنف باغ و بہار بھی دہلی سے چل کر عظیم آباد ہی میں پناہ گزیں ہوئے۔

اس وقت بھی شاہ ارزانی صاحب قدس سرہٗ کے درگاہ پر ہر سال بڑے زور کا مشاعرہ ہوتا ہے دُور دُور سے اساتذہ تشریف لاتے ہیں حضرت سائل، احسن مارہروی بھی باہر سے ایک سال آئے تھے۔ حضرت سائل کا ایک مصرع یاد رہ گیا۔

اُنگلیاں اُٹھنے لگیں داغ کا داماد آیا

حضرت اَوج اور پیارے صاحب رشید کے وفات کے بعد اُن کے خاندان کے بزرگ نواب سرفراز حسین لطف علی خاں مرحوم، بادشاہ نواب مرحوم امام باندی مرحومہ کے ایام باڑوں میں ہر سال محرم میں آتے ہیں۔
اُردو زبان کی ترقی کے جدید ذرائع پر بھی ہم نے سرسری نظر ڈالی ہے لیکن زبان دانی اور اُس کی ترقی کے اصلی جوہر اس وقت معلوم ہوتے ہیں جب کہ بات چیت ہو۔ دہلی اور لکھنؤ والوں کا دعویٰ ہے کہ پوربیوں کو بولنا نہیں آتا ہے اور وہ فصیح اُردو نہیں بول سکتے۔ لکھنے کا مسئلہ تو طے ہوگیا کہ اس میں ہم کسی سے کسی صورت میں کم نہیں ہیں، رہا اب بولنا اس کے بارے میں ہمیں پہلے لکھنؤ اور دلی کا حال دیکھنا چاہیئے۔ دہلی چوں کہ پنجاب کے قریب ہے اس لئے وہاں کی آواز عموماً کچھ بھدی سی معلوم ہوتی ہے لیکن لکھنؤ واجد علی شاہ کی بدولت سب کچھ کھو چکا تھا اس کی زبان میں ذرا لوچ ہے۔ لیکن اگر زبان دانی کے یہ معنی ہیں کہ صرف ایک شہر یا اس شہر کے خاص حصے اور اُن خاص حصّوں کے بھی خاص لوگ صحیح و فصیح اُردو بولتے ہیں جیسا کہ لکھنؤ و دلّی کا حال ہے کہ ایک اسٹیشن ادھر آئے اور دیہاتیوں کی اس قدر سخت و کرخت و مہمل زبان سُنئے کہ سر ٹیک کر مر جائیے اور سمجھ میں نہ آئے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا اعظم آباد ہرگز ہرگز اُن سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے پٹنہ میں اکثر ایسے ہی لوگ ہیں جن سے آپ گھنٹوں گفتگو کیجئے کیا مجال کہ ایک لفظ بھی غیر فصیح و غیر صحیح زبان سے نکل جائے اور غلط بولنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیوں کہ مادری زبان کوئی شخص غلط بول ہی نہیں سکتا۔
اہل لکھنؤ و دہلی ہمارے دیہاتیوں پر ہنستے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دیہاتیوں کا لہجہ ذرا سخت ہے ورنہ اُردو زبان پچھم کے دیہاتیوں سے زیادہ اچھی بولتے ہیں اور عام لوگوں میں بھی شاعری کا مذاق ہے چنانچہ ایک جگہ شادی تھی ایک رشتہ دار جو معمولی پڑھے لکھے تھے یعنی خط بھی مشکل سے لکھ سکتے تھے مدعو کئے گئے اُنھوں نے فی البدیہہ یہ رباعی کہدی ؎

بھائی واعظ! اور ہوں صفدر رچچا — وال شوئی کو بھی جائیں گے ہم
ماشی مریم بوبو کی کرواکے بیع — بھائی عتیق اللہ کو ترسائیں گے ہم

اس سے عمدہ ایک اور مثال ہے استھانوان اور دیسنہ دو بستیاں قریب قریب آباد ہیں اور زمانۂ قدیم آپس میں چشمکیں ہوتی رہتی ہیں۔ ۵۰ برس قبل اہل استھانوان نے ایک ہجو اہل دیسنہ کی لکھی اور بھیجی اتفاق

کہ پڑھے لکھے لوگ موجود نہ تھے چار پانچ کم استعداد لوگوں نے بیٹھکر فوراً اس ہجو کا جواب طے کرلیا اور اس سے اچھا۔ اس کے تین چار شعر ملاحظہ ہوں۔

سحر جو مرغِ سحر نے ہیں کیا بیدار | شراب کہنہ کا تھا چشم میں ہمارے خمار
جو دیکھیں باغ مرا صاحبانِ استھانوان | چھبیگا سینہ میں ہر اک کے نوکِ نیزۂ خار
لکھا ہے واہی تباہی نہ قافیہ نہ ردیف | کہ جیسے بکتا ہو بحران میں کوئی بیمار
ہمارے دلّی کے عالم فرشتہ سے بہتر | تمھاری بستی کا عالم جو ہیگا زشت و خوار
ہمارے دلّی کے شاعر رہیں سدا غالب | تمھاری شعر گوئی پر حسن شہید کی مار

یہ اشعار ایسے لوگوں نے کہے تھے کہ انھیں لکھانے کے لئے بچّوں کو بلانا پڑا تھا۔

زباں دانی میں اپنا حصّہ دکھانا ہمارا اصلی مقصد تھا اور جس طرح روح کے بغیر زندگی پھولوں کے بغیر باغ نہیں رہ سکتا اسی طرح زباں دانی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ زبان کی ترقی میں ہر حیثیت سے ساتھ نہ دیا جائے۔ ہم نے اس مضمون میں یہی دکھایا ہے کہ زبان دانی کے جتنے بھی شعبے ہوسکتے ہیں یعنی تصنیف و تالیف، شاعری و نثاری، تقریر و تحریر، بول چال، حاضر جوابی، صحیح ذوق، اشاعت زبان گویا اس قسم کی جتنی باتیں ہوسکتی تھیں تمام و کمال ہم میں موجود ہیں اور جب تمام لوازم موجود ہیں تو اس چیز کا وجود بھی ہے پس ہمارے صوبہ بہار کا زباں دانی میں حصہ لکھنؤ و دلّی کے برابر ہے اور ذرّہ برابر بھی کم نہیں۔

مضمون نے ایک کتابی صورت اختیار کرلی اور باوجود احتیاط کے مباحث نکلتے چلے آئے اس لئے یہیں پر ختم کرتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ ان تمام اسباب و لوازم پر غور و فکر کرنے کے بعد کوئی منصف مزاج شخص نہ ہوگا جو اب بھی ہمارا حصہ مساوی تسلیم نہ کرے گا۔ وما توفیقی الا باللہ

برکھارت کا پہلا مہینہ

نتیجۂ فکر

جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی۔ اے

میں ایک دوسرے مضمون کے ضمن میں اپنا یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ اُردو شاعری پر فارسی کا زیادہ تر اثر اس لئے بھی ہوا کہ اس نے شروع سے فارسی (عربی) عروض اختیار کیا۔ اور ہندی عروض (پنگل) اختیار نہ کرنے سے وہ بہت سی خوبیوں سے محروم رہ گئی۔ ذیل کی نظم اس خیال کی تائید میں پیش کی جاتی ہے۔ یہ خاص ہندی چیز ہے (یعنی برکھارت) ہندی ہی بحر میں ادا کی گئی ہے جو اس کے لئے موزوں بھی ہے۔ ہندی کے پیارے اور شیریں الفاظ کا میل اُردو فارسی لفظوں کے ساتھ اس طرح ملایا ہے کہ کلام کا حسن دوبالا ہو گیا ہے اور سُریلا پن کہیں ہاتھ سے نہیں جانے پایا۔ نازک خیال شاعر نے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار میں بڑی کاوش کی ہے اور تشبیہات کی جدت میں کمال دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہوں تیسرے بند میں بجلی کی تشبیہیں کس قدر سچی تصویر کھینچی ہے کہ بجلی کی ساری حرکتیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ آخر کے تین بند بھی خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہیں۔ الفاظ سے کیا کام لیا گیا ہے۔ یعنی خود لفظ ہلتے اور چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آخری دو بندوں میں اصل تصویر میں جو رنگ بھرا ہے وہ قابل داد ہے۔ (اڈیٹر)

(۱) آئے بادل کالے کالے جھومتے ہاتھی متوالے   اُمڈے پھیلے تلتے جھکتے

ایک اندھیری دیکر چھائے ڈیرے چار طرف ڈالے

(۲) جس نے دل پر بوجھ سا رکھا گرماؤسے دم گھبرایا

وہ آکاش کے بگڑے تیور تیوری پر بل جھلایا

(۳) بجلی چمکی انگارا سی آگ کی ناگن لہرائی

بھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی

(۴) بادل گرجے وہ گھڑگھڑاہٹ آئی لڑھکتی لڑھکاتی

باڑھوں پہ باڑھیں داغتی آئی اور کڑکتی کڑکاتی

(۵) بجلی چمکی بادل گرجے پون کے گھوڑے بدکائے

بجلی کوندی ٹوٹا تارا ہردے کڑک نے دہلائے

(۶) بجلی چمکے بادل گرجے مینھ اور پون دھواں دھار

بجلی ناچے تھاپ گرج کی مینھ نے چھیڑ دیا ستار

(۷) بجلی چمکے بادل گرجے مینھ برسے موسلا دھار

ہر سو پانی نیچے پانی اوپر پانی لگا تار

(۸) درخت سارے بھیگ کے چوڑ تیور دبکے دبکائے

کھڑے مویشی بھیگے بھگائے سمٹے سکڑے سکڑائے

(۹) بجلی چمکی بادل گرجے خوب ہی برسا برسایا

دم لے لے کر زور سے آیا تھم تھم کر زور گھٹایا

(۱۰) بادل ہو چلے بھورے بھورے گالے دھنکے دھنکائے

بجلی چمکے چاندنی جیسے نور کی چادر پھیلائے

(۱۱) دھیما دھیما مینھ بھی چھم چھم پون ملائم اتراتی

چکنے چکنے پتّوں پر سے موتی سی بوندیں ڈھلکاتی

پون کے گھوڑے سہمے ٹھٹکے

ایک خموشی سنّاٹا سا

برسے گا اور برسائے گا

لہریہ کاڑھا بیل بنائی

ادھر ادھر تڑپی تڑپائی

گڑوڑ ہا گھوڑے دوڑاتی

پہاڑ لڑھکاتی ٹکراتی

سوندھا سوندھا آیا چھینٹا

پون کا جھکڑ مینھ کا تریڑا

زور کا پانی وہ دھائیں دھائیں

پون کا گانا وہ سائیں سائیں

بھر گئے جل تھل بلبلے والے

دریا ندی نالے

چیخ پڑیں ہیں بعض نے ڈالی

اونگھتا کوئی کرتا جگالی

ایک سمندر مینھ کا بہایا

برکھا رت کا رنگ جمایا

دھواں ہوا میں جوں بل کھائے

گرج دور سی ڈھول بجائے

اٹھکھیلیاں کرتی اٹھلاتی

کھیلتی آتی چھیڑتی جاتی

(۱۲) چھل دلوں میں آپ ہی پیدا جان تراوت سی پائے   جانوروں میں جان سی آئی

اُچھلے کوئی کودے پُھدکے کوئی ناچے اور گائے   ایک خوشی ہر چیز پہ چھائی

(۱۳) پھٹ گئے بادل ابر کے ٹکڑے بہار اپنی دِکھلاتے   طرح طرح کی شکل بناتے

پھیلتے پھٹتے پھٹتے ملتے ملتے سمٹتے سمٹاتے   دَوڑتے تھمتے چلتے چلاتے

(۱۴) بادل بکھرے نیلا امبر ڈوبتے سورج نے جھانکا   کرنیں سنہری ترچھی ترچھی

بکھریں ہوائیں کھیلتی کھِلتیں میگھ کو سارا رنگ دیا   آکاش پہ اک آگ لگائی

(۱۵) نیلا امبر ہنستا سورج رنگ میں ڈوبے ہوئے بادل   کھلی پھننگوں پہ ہلکی دھوپ

دھوئی نہائی ہوئی سمندر سر پہ سنہری سا آنچل   قدرت کا اک سہانا روپ

خطباتِ گارساں دتاسی

(اُردو زبان و ادب پر)

(مترجمہ جناب سید راس مسعود صاحب بی اے (آکسن) لے ای ایس ناظم تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن)

پہلا خطبہ (بتاریخ ۲ر دسمبر ۱۸۵۰ء)



گارساں دتاسی ایک مشہور فرانسیسی عالم گزرے ہیں جو پیرس یونیورسٹی میں ہندوستانی یعنی اُردو زبان کے پروفیسر تھے۔ اُردو شعرا کا تذکرہ اِن کی مشہور و معروف تالیف ہے جو تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ علاوہ اِس کے وہ ہر سال ایک افتتاحی لکچر اُن طلبہ کو دیتے تھے جو اُن سے ہندوستانی زبان سیکھتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک جاری رہا۔ نیز انھوں نے ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک ہر سال ہندوستانی زبان و ادب پر تبصرے لکھے تھے۔ یہ تحریریں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئی تھیں۔ ہم جناب سید راس مسعود صاحب کے بیحد ممنون ہیں کہ انھوں نے اِس فاضل فرانسیسی کے (جو اُن کے والد مرحوم کا دوست بھی تھا) لکچروں اور تبصروں کا ترجمہ ”انجمن ترقیِ اُردو“ کے لئے فرمایا ہے۔ ایک غیر ملک کے عالم کی تحریریں جو ہمارے زبان کے مطالعہ اور عالمانہ تحقیق میں سالہا سال تک مصروف رہا ہے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی۔ (اڈیٹر)

حضرات! قبل اِس کے کہ میں نصاب کی اُس کتاب پر جو ہمارے سامنے ہے کچھ بیان کروں، میں ہندوستانی زبان کے علمی فائدے اور حقیقی ادبی دلچسپی کے متعلق چند لفظ کہنا چاہتا ہوں۔

عام طور پر لوگ پوری طرح یہ نہیں جانتے کہ ہندوستانی ہندوستان کے تمام صوبوں میں بولی جاتی ہے بعض جگہ اس کے ساتھ صوبہ کی دوسری بولیاں بھی شریک ہیں جیسے بنگال میں اور احاطۂ مدراس اور احاطۂ بمبئی میں اور بعض مقامات پر تنہا وہی بولی جاتی ہے جیسے ہندوستان کے صوبہ ممالک مغربی و شمالی، بہار، الہ آباد، مالوہ، اودھ، اجمیر، آگرہ، دہلی میں اور ان مقامات کے ساتھ لاہور اور نیپال کے نام بھی شریک کرنے چاہئیں۔

اگر کوئی شخص ان صوبجات میں بود و باش کرنا یا سیاحت کرنا چاہے تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی پروانۂ راہداری کے کرسکتا ہے، تو اس کے لئے ہندوستانی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی ملازمت میں (ملکی ہو یا فوجی) صرف انھیں اشخاص کو داخل کرتی ہے جو ہندوستانی زبان جانتے ہیں یا جو ہندوستانی زبان کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہو چکے ہیں۔

لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ ہندوستان میں صرف انگریز ہی کاروبار کرسکتے ہیں۔ بہت سے دوسرے یوروپین بھی وہاں معزز خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور اگر کوئی ہندوستانی جانتا ہو تو وہ آسانی سے آزادانہ حیثیت حاصل کرسکتا ہے۔ قطع نظر تجارت کے جو اکثر یورپینوں کا ذریعۂ دولت ہے، اگر کوئی چاہے تو طبابت کرسکتا ہے مصوّر کا پیشہ اختیار کرسکتا ہے۔ یا اگر اُسے ہندوستانی قانون (اسلامی اور انگریزی دونوں) کا علم ہے اور اسی کے ساتھ ہندوستانی بھی خوب جانتا ہے تو وہ وکالت کرسکتا ہے۔

حتیٰ کہ پادری، بیگم شمرو کے خوبصورت گرجا میں جو سردھنہ میں ہے یا آگرہ کے کیتھلک چرچ یا دوسری مقامات میں وعظ و تلقین کرسکتے ہیں۔ خود کلکتہ میں ایک گرجا ہے جسے ہندوستانی گرجا کہتے ہیں اور جو اُن ہندوستانیوں کے لئے تعمیر کیا گیا ہے جو انگلش چرچ کے ذریعہ سے عیسائی ہو گئے ہیں، وہاں تمام عبادت ہندوستانی زبان میں ہوتی ہے۔

عام طور پر اس کا علم نہیں ہے کہ ہندوستان کے بڑے شہروں میں دیسیوں کے پاس لیتھو کے مطبع بھی ہیں جہاں روزانہ ہندوستانی زبان کی کتابیں چھپتی ہیں، ان میں ترجمے بھی ہوتے ہیں اور تصنیفات بھی۔ میں صرف ممالک مغربی شمالی کا ذکر کرتا ہوں جس کا نام میں نے ابھی لیا تھا۔ وہاں اس سال کی پہلی جنوری کو ۲۳ مطبع تھے جن میں صرف گزشتہ سال (۱۸۴۹ء میں) ۱۴۱ مختلف قسم کی کتابیں طبع ہوئی تھیں۔

علاوہ ان کے ۲۶ اخبار اور رسالے بھی انھیں مطبعوں میں چھپتے تھے جن میں سے ۲۳ ہندوستانی زبان کے تھے

دو فارسی کے اور ایک بنگالی کا۔ اب اگر ان میں وہ اخبار اور رسالے بھی شامل کرلئے جائیں جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں شائع ہوتے ہیں تو ہندوستانی اخبارات کی کُل تعداد جو اِس وقت موجود ہے آسانی سے پچاس ہو جائے گی۔

ہندوستانی زبان بلاشبہ ترقی پذیر ہے۔ اِس سے میرا یہ مطلب ہے کہ بجائے لوگوں کی معمولی اور روزمرّہ کی زبان کے یا عوام پسند گیتوں کی زبان کے وہ گورنمنٹ کی سرکاری زبان ہوگئی ہے جیسے پہلے فارسی تھی۔ یعنی اب وہ سیاسی مراسلت، عدالتوں اور انتظامی محکموں کی زبان ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی میں اب سائنس پر رسالے اور کتابیں لکھی جانے لگی ہیں جو اب تک صرف فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔

ہندوستانی زبان کی اُن کتابوں میں سے جو حال میں شائع ہوئی ہیں بہت سی سائنس، جغرافیہ، قانون اور دوسرے علوم پر ہیں، کچھ تو جدید تصنیفات ہیں اور کچھ انگریزی کے ترجمے ہیں۔ کچھ دینی اور مذہبی مختلف فیہ مسائل کی کتابیں بھی ہیں جن میں ہم کیتھلک مذہب کی بھی بعض کتابیں شامل کرتے ہیں جو آگرہ میں چھپی ہیں ان میں قدیم و جدید زمانہ کی چند تاریخیں اور اخلاقی اور مذہبی کتابوں کے ترجمے بھی ہیں۔ مثلاً بنین کی پل گرمس اور ریمسن کی سیلف نالج کے ترجمے۔ قصّے کہانیوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً ریسے لاس اور قزلباش۔ بعض نظموں کے ترجمے بھی کئے گئے ہیں۔ مثلاً گے کی حکایتوں کا ترجمہ۔

یہ امر پوشیدہ نہیں کہ سنسکرت سے بھی بہت سے ترجمے ہندوستانی میں ہوئے ہیں، لیکن یہ حال میں طبع اور شائع نہیں ہوئے۔ مگر عربی فارسی سے بہت سے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ اِن میں قرآن شریف کے کئی ترجمے ہیں جو تفسیر کے ساتھ چھپے ہیں، ایک عربی لغات بھی ہے جس میں الفاظ کے معنی ہندوستانی میں دیئے ہیں کئی عربی فارسی کی صرف و نحو کی کتابیں، گلستاں کے متعدد ترجمے، الف لیلہ کے دو ترجمے، اخلاق جلالی، اخلاق محسنی کے ترجمے، شاہ نامے کا ایک خلاصہ، ابن خلکان، تاریخ ابو الفدا اور (قصیدۂ) بُردہ کے ترجمے ہیں۔

اصل تصانیف میں میں صرف چند دلکش نظموں کا نام لوں گا۔ یعنی شکنتلا، لیلیٰ مجنوں، ابراہیم ادھم اور حسن و عشق کے مشہور قصوں کو منظوم کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے چند سیاحت نامے اور چند تاریخیں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں سے ایک ٹیپو سلطان کے باپ حیدر علی کی تاریخ ہے جو شاہ میسور کے ایک بیٹے نے لکھی ہے۔ نثر میں بہت سے

ناول اور قصے کہانیاں، لغت پر بعض مفید کتابیں اور ایک انگریزی کی صرف و نحو پر بھی لکھی گئی ہے۔ آخر میں میں حال کے زندہ ہر دلعزیز شعرا یعنی مومن، نصیر، ذوق، ناسخ اور آتش کے کلام کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ شاعر اس وقت و زمانہ حال کی ہندوستانی زبان پر بہت بڑا اثر رکھتے ہیں۔

دوسرا خطبہ (بتاریخ ۴ دسمبر ۱۸۵۱ء)

حضرات! مجھے دلی مسرت ہے کہ اس تعلیمی سال کے افتتاح پر میں اپنے لکچروں میں نئے اور پرانے شاگردوں کو دیکھتا ہوں۔ آپ نے ہندوستانی زبان کے مطالعہ کا جو شوق کیا ہے وہ میری رائے میں بہت مستحسن ہے۔ یہ دُنیا کی نہایت وسیع الاشاعت زبانوں میں سے ہے۔ کیوں کہ آٹھ کروڑ سے زیادہ اشخاص اسے بولتے ہیں اور سیاسی اور تجارتی لحاظ سے خاص طور پر قابل لحاظ اور لایق وقعت ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں حقیقی ادبی دلچسپی پائی جاتی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے براعظم یورپ میں اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس زبان کی ہندو شاخ سنسکرت کی ایک سادہ اور سلیس صورت ہے اور اس کا ہندوستانی زبان سے تقریباً وہی تعلق ہے جو جدید یونانی زبان کا قدیم یونانی زبان سے اور اطالوی کا لاطینی سے ہے۔ لہٰذا اس کا علم السنۂ ہندوستان کے عالم کے لئے نہایت کارآمد ہے وہ جدید صورتوں میں کہیں تو قدیم شکلوں کا اختصار اور کہیں اُن کی توسیع دیکھے گا۔ اس کی اسلامی شاخ اُن لوگوں کے لئے بہت مفید ہے جن کا تعلق فارسی کے مطالعہ سے ہے۔

فارسی اور ہندوستانی کی اصل ایک ہی ہے، لیکن ہندوستانی کی ساخت اور طرز ادا زیادہ سلیس اور سادہ ہے۔ اگر فارسی کے طویل جملے ہندوستانی کی ساخت کے مطابق ادا کئے جائیں تو مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ آپ صاحب جو ان شیریں اور خوبصورت زبانوں کا مطالعہ کر رہے ہیں، میرے اس بیان کی تصدیق خود فرما لیں گے۔ ان میں سے ایک سنسکرت ہے جو ہمارے تمام یورپی زبانوں کی اصل ہے اور اس کا تعلق اب تو سامی زبانوں سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ خیال یہ ہے کہ عربی کا سہ حرفی مادہ مصنوعی ہے اور ان میں کے بہت سے مادے ایک بول کے ہیں، اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ بھی سنسکرت کے اصول پر بنے ہیں اور بہت سے سنسکرت اور عربی کے مادوں کی اصل مشترک ہے۔ دوسرے فارسی زبان ہے جو تاریخی تصانیف سے

مالا مال ہی اور اِس کا ادب خاص امتیاز او خصوصیت رکھتا ہے جس میں اسلامی تصوّف نے نئی جان ڈال دی ہی۔ ہندوستانی زبان کی ہندوی اور اسلامی شاخوں کا علم ادب صرف کیثر ہی نہیں بلکہ مختلف نوعیت کا بھی ہی ہندی میں سنسکرت کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے موجود ہیں یا کم سے کم اُن کا تتبع کیا گیا ہی اور اردو اور دکھنی میں ہم فارسی کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے یا اُن کے نمونے دیکھتے ہیں۔

اِس سال کے دَوران میں میں آپ سے اِن مختلف زبانوں کی بعض ادبی تالیفات کا ذکر کروں گا۔ سنسکرت کے فریق سے (جن کی زبان ہندو ہندوستانی ہے) ہمیں شکنتلا کا دلچسپ قصہ ملے گا جو یورپ میں بہت مشہور اور ہر دلعزیز ہی۔ علاوہ اس کے ہم اُسچا کا قصہ بھی پڑھیں گے جو اگرچہ اس قدر معروف نہیں مگر بہت دلکش ہی۔

فارسی کا فریق (جن کی زبان اسلامی ہندوستانی ہی) ولی کا دیوان پیش کرے گا۔ ولی ہندوستان کا حافظ ہی۔ اگرچہ اِس کی غزلوں میں کسی قدر تکلف پایا جاتا ہی لیکن اُن میں حقیقی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ اور اس کی غزلیں خوبی میں کسی طرح فارسی غزلوں سے کم نہیں۔ نثر میں ہم شیرشاہ کی تاریخ کا ایک حصہ پڑھیں گے، جس میں ہم علاوہ دوسری باتوں کے ہندوستان کی اسلامی حکومت کے انتظامات کے متعلق عجیب واقعات دیکھیں گے۔

اب رہا خالص ہندوستانی فریق، میں اُس سے ایک کتاب مہر و ماہ لے کر آپ کو سناؤں گا۔ یہ ایک فسانہ ہی جس میں آپ اقوام کے متعلق مفید اور پُر از معلومات تفصیل پائیں گے جو جدید اور انوکھے استعاروں سے اور پُرلطف ہو گئی ہی۔

آخر میں میں آپ کو کلجگ کا شاعرانہ بیان سناؤں گا۔ کلجگ وہی ہی جسے یونانی دیومالا میں لوہ جگ کہتے ہیں یہ نظم ہو بہو انگریزی شاعر ڈرای ڈن کی نظم سے ملتی ہی۔ اُس نے بھی اسی مضمون پر طبع آزمائی کی ہی[1]۔

---

[1] انسان اخلاقی ہاتھوں سے چھوٹ کر آزاد ہو گیا ہی۔ — Mankind is broken loose from moral hands,

مہمان نوازی کے حقوق اب مطلق باقی نہیں رہے۔ — No rights of hospitality remain;

مہمان میزبان کے ہاتھوں سے قتل ہوتا ہی۔ — The guest, by him who harboured him, is slain;

داماد خسر کی جان کا درپے ہی۔ — The son-in-law pursues the father's life.

بیوی خاوند کی قاتل ہی اور خاوند بیوی کی جان کا لاگو ہی۔ — The wife the husband murders; he the wife.

ان میں سے اکثر تالیفات نظم میں ہیں۔ لیکن آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ چونکہ یہ کتابیں نظم میں ہیں تو نثر سے مشکل ہوں گی۔ یہ بات نہیں ہے۔ اگرچہ نظم میں زبان کی ساخت اور ترکیب کے معمولی قواعد کی پابندی نہیں کی جاتی اور بعض وقت ایسی ترکیبیں آجاتی ہیں جو مصنوعی اور خلاف روزمرّہ معلوم ہوتی ہیں یا نثر کے مقابلہ میں اس کی تشبیہات و استعارات زیادہ مُبالغہ آمیز ہوتے ہیں، تاہم نظم میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اِس میں صاف طور سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مطلب یہاں ختم ہوتا ہے۔ کیونکہ نظم میں مطلب گڈمڈ نہیں ہونے پاتا اور ایک جگہ سے پھاند کر دوسری جگہ نہیں پہنچ جاتا۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ مطلب ایک ہی شعر میں ختم ہو جاتا ہے اور کسی حالت میں ایسا نہیں ہوتا کہ دو یا تین شعروں سے آگے نکل جائے۔

جس طرح ہندوستانی کے لکھنے کے دو طریقے ہیں، ایک فارسی حروف میں، مُسلمان ہندوستانی کے لئے اور دوسرا دیوناگری میں ہندو ہندوستانی کے لئے۔ اسی طرح عروض بھی دو ہیں، یعنی شعر کی تقطیع کے بھی دو طریقے ہیں۔ ہندوستانی کی اُردو اور دکھنی شاخ کے لئے عربی عروض استعمال کیا جاتا ہے (البتہ زبانوں کے فرق کی وجہ سے اِس میں مناسب تغیّر و تبدل کر لیا گیا ہے) اور ہندی کے لئے سنسکرت عروض کا ایک سادہ طریقہ مستعمل ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، عرب شعر کو خیمہ کے مثل سمجھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُس کا نام عربی میں "بیت" ہے جس کے معنی خیمے کے ہیں اور بعد ازاں گھر کے ہو گئے۔ خیمے میں دو دروازے ہوتے ہیں۔ ان دروازوں کو "مصرع" کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شعر کے دو ٹکڑے "مصرع" کہلاتے ہیں۔ خیمہ کھمبوں (ارکان) پر کھڑا ہوتا ہے۔ شعر کے مختلف اوزان ہوتے ہیں، جن میں دس اصل ہیں اور بہتّر فروع۔ خیمہ کا اندرونی حصّہ اوٹ (فاصلہ) سے الگ الگ کر لیا جاتا ہے اور خیمہ میخوں (وتد) اور رسیّوں (سبب) سے باندھا جاتا ہے۔ یہ وہ نام ہیں جو بحر طویل اور بحر قصیر کی چھ تقسیموں کو دیا جاتا ہے۔

اصول اور فروع کے ملنے سے بے شمار بحریں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن اُردو اور دکھنی میں صرف تیس استعمال کی جاتی ہیں۔ اشعار ہمیشہ مُقفّیٰ ہوتے ہیں۔ اگر قافیہ ہر مصرع میں پایا جائے تو قافیہ ہر بیت میں بدل جاتا ہے اور اگر قافیہ صرف آخر میں آئے، تو تمام میں وہی رہیگا۔

ہندو طریقہ زیادہ سادہ ہے۔ اِس میں صرف بول (*Syllable*) کا خیال رکھا جاتا ہے خواہ چھوٹا ہو یا

بڑا۔جیسا انگریزی میں ہے۔ اور بعض اوقات جیسا انگریزی میں ہوتا ہے ضرورت شعری کے لئے بولوں کو مختصر کر کے ایک کر دیتے ہیں یا کبھی اس کے برعکس کرنا پڑتا ہے۔ اسے "ماترا" کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھی اس کا یہی نام ہے۔

ہندوی اور مسلمانی دونوں شاخوں میں نظم مقفےٰ ہوتی ہے اور اکثر دونوں مصرعوں میں قافیہ پایا جاتا ہے۔ ہندی میں چوپائی کا بہت رواج ہے جو سنسکرت کے اشلوک سے بہت ملتی جلتی ہے اور اس کے ہر مصرع میں آٹھ بول ہوتے ہیں۔ "دوہرہ" فرد کے مقابل میں ہے "فرد" عرب کا "بیت" ہے جو دوسروں سے الگ تھلگ ہے۔ اس کے ہر مصرع میں بارہ سے چودہ بول تک ہوتے ہیں۔

حضرات! میں مطالعہ کے دوران میں اس کا خیال رکھوں گا کہ آپ کو اوزان بتاتا جاؤں اور جن اصول کا بیان آپ کے سامنے کیا گیا ہے ان کے مطابق تقطیع کرتا جاؤں۔

جس زبان کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ واقعی طور پر زندہ زبان ہے۔ کیونکہ جس وقت ہم پیرس میں وہ کتابیں پڑھ رہے ہوں گے جن کا نام میں نے لیا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں سینکڑوں مطبوعات شائع ہو رہی ہوں گی۔ یورپ میں بیٹھکر انسان ہندی اور ہندوستانی کتابوں، پمفلٹوں، اور وقتی رسالوں اور اخباروں کی تعداد کا جو ہندوستان میں شائع ہوتے ہیں صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔

گزشتہ سال میں نے آپ سے بیان کیا تھا کہ ممالک مغربی وشمالی میں جسے سرکار انگریزی ایک بڑا صوبہ بنانے والی ہے اور جس کا دارالحکومت لاہور ہوگا اور جہاں کی زبان صرف ہندوستانی ہے، جنوری ۱۸۵۰ء میں ۲۳ سنگی مطبع تھے جن میں ہندوستانی کتابیں چھپتی تھیں۔ گزشتہ سال ہی لاہور میں ایک اور مطبع قایم ہوا۔ گویا اس سال یکم جنوری کو مطبعوں کی تعداد چوبیس ہو گئی۔ یعنی سات آگرہ میں، پانچ دہلی میں، دو میرٹھ میں، دو لاہور میں، چار بنارس میں، ایک بریلی میں، ایک کانپور میں، ایک شملہ میں، اور ایک اندور میں۔ لیکن ہندوستان کا یہی ایک حصّہ ایسا نہیں ہے جہاں ہندوستانی کتابیں اور اخبار چھپتے اور شائع ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مطبعے تین احاطوں کے دارالحکومتوں میں نیز بہت سے دوسرے شہروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ صرف ایک لکھنؤ ہی میں تیرہ ہیں جو مصروف بکار ہیں۔

چند ہی روز ہوئے میرے پاس ہندوستانی کتابوں کی ایک مفصّل فہرست پہنچی ہے۔ اس میں بہت سی کتابیں ہیں اور ہر قسم کی ہیں۔ کچھ جدید تصنیفات ہیں اور کچھ ترجمے۔ یہ سب کتابیں ۱۸۵۰ء میں ممالک مغربی وشمالی میں شائع ہوئی ہیں۔

حضرات! میں ان میں سے چند کتابوں کے نام گنواتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اِن کا ذکر ادبی یا فلسفیانہ دلچسپی کی وجہ سے شوق سے سُنیں گے۔ علاوہ دوسری کتابوں کے قرآن شریف کے متعدد اڈیشن عربی اُردو میں شائع ہوئے ہیں، ایک اسلامی نظم جس میں محمدؐ رسول اللہ (صلعم) کے معجزات کا ذکر ہے۔ ردِ فرقۂ وہابی ہندی میں کئی رسالے جین مت پر نظیر اکبر آبادی کی نظموں کا مجموعہ ان کا حال ہی میں انتقال ہوا اور ہندوستان میں بحیثیت شاعر کے ان کی بڑی شہرت اور عزت تھی مشہور صوفی علی حزیں کی سوانح عمری، جو علاوہ اور باتوں کے بعض بہت دلچسپ کتابوں کے مصنف بھی تھے جن کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔ تاریخ پنجاب مصنفہ دیبی پرشاد ساکن بنارس۔ تاریخ خاندان سندھیا مصنفہ دھرم نراین ساکن اندور۔ ایک قصۂ نظم میں جس کا نام لخت جگر ہے بال مکند سکندر آباد کے رہنے والے نے لکھا ہے۔ اگرچہ یہ شخص ہندو ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے مگر اِس نے یہ تصنیف اُردو میں کی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ اُردو شمال میں "مسلمانوں کی ہندوستانی" ہے۔

ہندوستانی ادب کے شعبوں میں سب سے مقدم شاعری ہے اور اسے بڑی کامیابی اور ذوق و شوق کے ساتھ ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس مقدس آگ کو خاص ادبی جلسوں کے ذریعہ سے جن کا نام مشاعرہ ہے زندہ رکھا جاتا ہے ہندوستانیوں میں اس قسم کے ادبی جلسوں کا خاص ذوق ہے۔ یہاں تک کہ اور لوگ بھی (شاعری جن کا پیشہ یا فن نہیں ہے) شوقیہ طور پر مُعیّنہ ایّام میں عموماً پندرہ روز میں ایک بار اپنے گھروں پر شام کے وقت ایسے جلسے کرتے ہیں جس شخص کے مکان پر یہ جلسہ ہوتا ہے وہی میر مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ وہ شہر کے اُن تمام اصحاب کو جو شعر سے شوق سے رکھتے ہیں دعوت دیتا ہے اور ان سے درخواست کرتا ہے کہ اِس موقع کے لئے فلاں بحر میں (مصرع طرح پر) شعر کہنے کی زحمت فرمائیں۔

اِس وقت کے نہایت مشہور زندہ شاعروں میں دو بادشاہ بھی ہیں۔ ایک شہنشاہ دہلی دوسرے بادشاہ اودھ۔ اِس سے ہندوستان کے مسلمان بادشاہ اور فرمانروا فارسی بولتے تھے اور فارسی ہی لکھتے تھے اور معمولی (بول چال کی) زبان کو حقیر سمجھتے تھے لیکن آج وہ اپنی رعایا کی تقلید میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے خواہ تحریریں ہوں یا تقریریں، ہندوستانی زبان استعمال کرتے ہیں۔

حضرات! ان دو بادشاہ شاعروں میں سے پہلے بہادر شاہ ثانی ہیں جو شاہ عالم کے پوتے ہیں اور خود

اِن کا بھی ہندوستانی شعرا میں شمار ہے۔ بادشاہ کے بیٹے شاہزادہ دارا بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ بادشاہ کا تخلص ظفرؔ ہے اور جب اِن کا ذکر شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے تو اِسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ دوسرے واجد علی شاہ ہیں۔ اِن کا تخلص اختر ہے۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں موسیقی میں بھی ماہر ہیں۔ جو غزلیں وہ لکھتے ہیں اُن کے راگ راگنیاں بھی وہ خود ہی تجویز کرتے ہیں۔ اِن دونوں بادشاہ شاعروں کا کلام ہندوستان میں بہت مقبول ہے۔ اور جو کلام میں نے اُن کا پڑھا ہے، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو وہ اِس کے مستحق ہیں۔ اُن کے حق میں بلا کسی مبالغہ کے عربی کی یہ مثل بالکل صادق آتی ہے "کلام الملوک ملوک الکلام"۔

مثنوی حسن و عشق

یعنی

خواجہ حسن و بخشی طوائف

یہ مثنوی جرأت مرحوم کی ہی۔ جرأت کا کلام بہت ضخیم اور کثیر ہے اور اکثر حصّہ اُس کا اب تک طبع نہیں ہوا۔ یہ مثنوی بھی اب تک کبھی نہیں چھپی۔ جرأت کا کلام سلاست، صفائی اور فصاحت کے لئے مشہور ہی اُس مثنوی میں بھی یہ تمام خوبیاں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں۔ جرأت روزمرہ کے اُستاد ہیں اُن کے کلام سے اِس زمانہ کے روزمرّہ اور بول چال کا خوب اندازہ ہوتا ہی۔ اِس مثنوی میں بعض الفاظ اجنبی معلوم ہوں گے، مگر یہ اُس زمانہ کی زبان ہی۔ اہلِ دکن کو اِس میں اپنی زبان کی جھلک نظر آئے گی۔ مثلاً "نے" کا استعمال اور عدم استعمال۔ یا مثلاً "کلاّ" کا لفظ (بمعنی شور غل) جو حیدرآباد میں اب بھی اسی طرح استعمال ہوتا ہی۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زبان ایک ہی ہی صرف بعدِ مسافت و زمانہ کی وجہ سے جو تغیر و اصلاح وہاں ہوئے یہاں نہو نے پائے۔ (اڈیٹر)

سب اُس کے رنگ ہیں ہی وہ خدا ایک ۔۔۔ کہ عشق اور حسن کو جس نے کیا ایک
اُسی دیکھو تو ہے ہر رنگ میں وہ ۔۔۔ عیاں گُل میں نہاں ہر سنگ میں وہ

یہ کچھ شعلہ جو کوہِ طور کا تھا ۔۔۔ سو ایک پرتو اُسی کے نور کا تھا
وہ ہی ہر رنگ میں اور پھر خدا ہی ۔۔۔ خدا ہی وہ خدا ہے وہ خدا ہے

غرض ہو اُس کی وحدت کا بیاں تب ۔۔۔ جو سب اعضائے تن ہوں ایک زباں اب
کہاں لوح و قلم کی ہے یہ قدرت ۔۔۔ رقم جو کر سکے کچھ اُس کی وحدت

اگر کہیے زمین و آسماں ایک ۔۔۔ نہو وے اُس کی وحدت کا بیاں ایک (ق)
کہ وہ دریا ہی اور عالم ہے قطرات ۔۔۔ بیاں پھر جزو سے ہو کل کی کیا بات

سزاوارِ ثنا ہے نام اُس کا ۔۔۔ بہت مشکل ہی اب ارقام اس کا
غرض جو کہیے اُس کو سو بجا ہی ۔۔۔ کہ ہم بندے ہیں اُس کے وہ خدا ہے

کیا ہی عشق کو پیدا اُسی نے ۔۔۔ کیا ہر ایک کو شیدا اُسی نے
کہیں بلبل کا دل گُل سے لگایا ۔۔۔ کہیں شمشاد قمری کو دکھایا

کتاں کو دی اُسی ذرّہ کی چاہ — کیا خورشید سے ذرّہ کو آگاہ
دیا پروانے کے تئیں شمع کا عشق — (ق) اگرچہ اُس کو دیتا ہے جلا عشق

ولے ڈر اُس کو کچھ جی کا نہیں ہے — جلے ہی اور کچھ پروا نہیں ہے
دکھادی کوہ کن کو آنِ شیریں — کہ آخر اُس نے کھو دی جانِ شیریں

زلیخا کو کیا یوسف پہ مفتوں — بنایا قیس کو لیلےٰ کا مجنوں
اگر یارو نہ ہوتا عشق کچھ خوب — پیمبر کو خدا کو کہتا نہ محبوب

اگر ہوتی نہ ذاتِ عشق پیدا — نہ ہوتا حُسن کا جلوہ ہویدا
ہوا ہی عشق ہی سے حسن ظاہر — یہ وہ سمجھے کہ جو ہو اس سے ماہر

نہ تھا پہلے نشاں ارض و سما کا — یہ بحرِ عشق تب سے موج زن تھا
یہی ہے نزدِ عاشق کلمۂ حق — کہ ہے بحرِ محبت ذاتِ مطلق

ولے جب جوش میں دریا یہ آیا — ہوا تب گوہرِ حُسن اس سے پیدا

در نعت حضرت سیّد المرسلینؐ

وہ گوہر کون ہے ذاتِ پیمبرؐ — کہ بحرِ معرفت کا ہے وہ گوہر
حقیقت کی صدف میں تھا وہ پنہاں — کیا پھر خواہشِ حق نے نمایاں

وہ ہے دریائے وحدت کا درِ خاص — ہوا حق کا ارادہ حق کا غواص
کہوں کیا وصف ختم المرسلیں کا — غرض لنگر ہے وہ کشتیِ دیں کا

حقیقت اور حق کی معرفت کُل — طریقت مل شریعت کا بندھا پُل

در منقبت سیّد اوصیاؑ

وہ فخرِ ہر نبی و ہر ولی ہے — کوئی ایسا نہیں اِلّا علی ہے
کہ ہے ذاتِ نبی و مرتضیٰ ایک — نہیں ہے ایک سے ہرگز جدا ایک

وہ ہیں جوں لولو و دُرِ عزیز دو — کہ جیسے ایک شے کے نام ہوں دو
خدا معشوق یہ عاشق ہیں صادق — یہ معشوق اور خدا ہے ان کا عاشق

خدا کا گرچہ پیغمبر ہے محبوب — سو وہ طالب ہے اور حق اس کا مطلوب

تاثیرِ عشق

بیاں کیا کر سکوں تقریرِ عشق آہ — غضب ہے قہر ہے تاثیرِ عشق آہ
جو بلبل ہے کلی سے نوحہ گر ہو — تو غنچے کا وہیں ٹکڑے جگر ہو

جو قمری کرتی ہے فریادِ جانکاہ — تو ہے پھر سرو بھی خود صورتِ آہ
اگر ذرّہ کو بیتابی ہو یارو — سراپا مہر کو بھی تھرتھری ہو

کتاں کا چاک ہوتا ہے جو دل گاہ — تو سینے پر رکھے ہے داغ ایک ماہ
اگر پروانہ شب کو جل کر رہ جائے — سحر تک شمع پانی ہو کے بہ جائے

یہ ہے تاثیرِ عشق کا در پے ۔ کہ اب تک کہربا تنکے چنے ہے
رہا ہے قیس جس وادی میں بیدل ۔ تو نکلا ہے واں لیلیٰ کا محمل

نہو جو قایلِ تاثیرِ عشق آہ ۔ سُنے تنک مجھ سے یہ احوال جانکاہ
عجائب ہے نپٹ افسانۂ عشق ۔ وہی سمجھے جو ہو دیوانۂ عشق

سُنے اب وہ ہی یہ قصۂ غم آلود ۔ جو پہلے کر دے اشک آنکھوں میں موجود
زباں پر گر یہ سوزِ عشق آجائے ۔ دل و جاں کو بر نگِ شمع سلگائے

کہے جب قصہ خواں کوئی حکایت ۔ تو آجاتا ہے وہیں خوابِ راحت
غرض جو کوئی اس قصہ کو کہوائے ۔ تو دل کو بیکلی ہو نیند اُڑ جائے

سُنو یارو بیانِ عشق ہے یہ ۔ عجائب داستانِ عشق ہے یہ
کریں گی چشم سب کی خونفشانی ۔ کہ حسن و عشق کی ہے یہ کہانی

آغازِ داستان

شروع داستاں کا ہے یہ مذکور ۔ کہ ہے ایک شہر فیض آباد مشہور
ہوا تھا شہر دہلی جب سے غارت ۔ تھی اپنی اُس جگہ میں استقامت

فلک نے کر جہاں آباد برباد ۔ کیا تھا خوب فیض آباد آباد
تو جو تھے ساکنانِ شہر دہلی ۔ سکونت اُن کی فیض آباد میں تھی

کہ ناگہ ایک بزرگ آیا جو اُس جا ۔ ہوا شدت سے میں مشتاق اُس کا
میسر آئی بارے مجھکو صحبت ۔ بجا ہے گر کہوں پیرِ طریقت

کہ وہ اب شمع بزمِ عارفاں ہے ۔ فروغِ دودمانِ سالکاں ہے
بیاں کیا کیجیے اُس کے کمالات ۔ وہ ہے آگاہ ہر علم و کرامات

اُسے کہنا بجا فخرِ زماں ہے ۔ کہ عالی سب سے اُس کا خانداں ہے
چراغ ہر لے کر چرخِ گرداں ۔ جو ڈھونڈھے تو نہ پاوے ایسا انساں

کہ ہے وہ گوہرِ بحرِ سیادت ۔ بجو ہر نیرِ برجِ سعادت
بجا ہے گر کہوں اُس کو ولی ہے ۔ نبیؐ کی آلِ اولادِ علی ہے

کروں در پردہ تا کے وصف ارقام ۔ ہے اُس کا حضرتِ خواجہ حسن نام
وہ ہے ہی مبتلائے ذاتِ باری ۔ نشانِ حضرتِ خواجہ کمہاری

نہ سمجھے نیک جو اُس کو وہ بد ہے ۔ کہ اُس کی حضرتِ مودود جد ہے
کروں کیا اُس کا وصفِ حسنِ تحریر ۔ کہ حیراں جس پہ ہے ہر ایک تصویر

غرض اُس کا ہے بے ہمتا جمال اب ۔ وہ رکھتا ہے جمالِ بیمثال اب
جو گلشن میں قدم رنجہ وہ فرمائے ۔ تو پابوسی کو شاخِ گل بھی جھک آئے

کرے نرگس طلب حق سے بصارت ۔ کہ دیکھوں میں کسی صورت سے صورت
کہے سوسن زباں میری ہو گویا ۔ بظاہر تو کہوں کچھ وصف اُس کا

نہیں کچھ سرو سے آزاد قمری ۔ اُسی پر ہیں فدا شمشاد و قمری
اُسی گل کے لیے نالاں ہے بلبل ۔ کرے غنچہ نثار اُس پر زرِ گل

جو ہو منظور اُس کی نذر لانا ۔ کرے فوّارہ بھی خالی خزانا
جو بوئے پیرہن ٹک غنچہ پا دے ۔ نہ پیراہن میں پھر پھولا سماوے

چمن میں اُس سے یہ شادی ہو یارو ۔ کہ شہنائی بجادیں نخلِ شبو
جو دیکھے اُس کی صورت شب کو ناگاہ ۔ کرے ٹکڑے جگر مثلِ کتاں ماہ

پری بھی دیکھ کر دیوانہ ہو جائے ۔ جو دیکھے شمع تو پروانہ ہو جائے
وہاں رہتا تھا میں خدمت میں دن رات ۔ نہ تھی بندے سے پوشیدہ کوئی بات

ہمیشہ لوگ کرتے تھے یہ تقریر ・ کہ حضرت عشق میں اب کم ہی تاثیر
کہاں اب وہ زمانہ اور وہ عاشق ・ اثر کرتا تھا جن کا عشق صادق

مئے الفت سے تھے وہ مست مدہوش ・ سدا جو خم تھی اُن سی جوش پر جوش
یہاں جب عاشقوں نے کچھ نہ چھوڑا ・ تو منہ میخانہ ہستی سے موڑا

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند ・ تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند
یہ فرمایا انھوں نے سن کے ایک بار ・ کرو تم قدرت حق کا نہ انکار

ہنوز آں ابر رحمت در فشان است ・ مے و میخانہ با مہر و نشان است
کسی نے گر پیا پیمانہ عشق ・ تو دکھلا دیں گے ہم دیوانہ عشق

زبس رہتا تھا میں اوقات حاضر ・ ہوا تھا راز پنہانی سے ماہر
کہ خوباں سے انھیں ہے انس بیحد ・ نسا ہو خواہ اس میں خواہ امرد

یہ سچ ہے جو ہو سر حق سے آگاہ ・ تو ہووے خوب رویوں کی اسے چاہ
زبس شاہد پرستی اُن کا تھا شوق ・ نہایت سیر سے خواجہ کو تھا ذوق

کبھی جو سیر کرتے حسب دل خواہ ・ تو پھر ہوتا تھا یہ عاصی بھی ہمراہ
یہاں تک خوب رو تھے اور گل اندام ・ وہ حاضر صبح سے رہتے تھے تا شام

نہایت تھا سرود و رقص کا شوق ・ اسی کے دیکھنے سننے کا تھا ذوق
جو مطرب خوب رو تھے اُس نگر میں ・ نہ تھا پنہاں کوئی سب تھے نظر میں

کبھی جاتے کبھی اُن کو بلاتے ・ وہ آکر ناچتے گاتے بجاتے
سدا تھی خوب رویوں سی ملاقات ・ کہوں کیا کچھ عجب کٹتی تھی اوقات

بیکایک یوں ہوا کرنا خدا کا ・ ہوا رنگ اور کچھ واں کی ہوا کا
نہ خوش آئی جو گردوں کو وہ صحبت ・ کیا صبح وطن کو شام غربت

حسیں جو جو کہ تھے واں رشک مہتاب ・ اٹاوی کو گئے ہمراہ نواب
جب اُس بستی سی خوباں کا ہوا کوچ ・ مقام دل سی عشرت نے کیا کوچ

یہ عاصی اپنے تھا نواب کے ساتھ ・ محبت کا یہ رشتہ جن کے ہے ہاتھ
زہے نواب نامی فخر صاحب ・ وہی یعنی محبت خان صاحب

بہ فن شعر ایک عالم کے استاد ・ بہ فن عاشقی مجنون و فرہاد
محبت کو ہی نام اُن کے سبب سے ・ محبوں کو ہی فخر اُن کے لقب سے

جو اُن کا شعر دیواں میں ہی مقطع ・ سر دیوان سب کے ہے وہ مطلع
مضامیں خانہ زاد اُس کے جہاں میں ・ بیاں کا علم سب اُس کی زباں میں

نکوئی نام کی اُس کا علم ہے ・ علم ایک ہاتھ کا اُس کے قلم ہے
جہانگیری یہ ہے اُس کے سخن کی ・ کہ گردن خم ہوئی گیو او پشن کی

شجاعت سے بہم ہے اُس کی تدبیر ・ قلم سے وہ کرے ہے کار شمشیر
اگر وہ تیغ کھینچے کس میں جاں ہو ・ عدم میں اُس سی شور الاماں ہو

سخا ایسا کف گوہر فشاں میں ・ کہ کچھ چھوڑی نہ باقی بحر و کاں میں
گدا جو در پہ اُس کے آ پکارے ・ تو لات ایک گور پر حاتم کی مارے

جو کچھ وصف اُس کا کہیے سو بجا ہے ・ محبت زور ہی نام خدا ہے
میں اِس کے ساتھ تھا اُس کا نمک خوار ・ سفر واں سی ہوا درپیش ناچار

سخن نکلا یہ خواجہ کی زباں سے ・ برائے سیر اب چلیے یہاں سے
تو کی میں عرض لب بستہ ہی وہ بات ・ پسند خاطر حضرت ہے جو بات

کیا ناگہ سفر سوئے اٹاوا ・ ولیکن ہو سیہ رو وے اٹاوا
عجب وحشت سرا تھی وانکی بستی ・ کسی صورت نہ اُس جاگہ لگا جی

اگرچہ سیر واں کی کو بکو میں ・ و لے پھر آئے واں سے لکھنو میں
کیا کرتے تھے ایک مذکور غائب ・ ہمیشہ خان عالم خان صاحب

زہے خاں ہیں سراپا لطف و احساں ۔ منور ماہ روشن مہر رخشاں
سنو حضرت سلامت تم مری بات ۔ کہ ایک مہ رو ہے مشتاقِ ملاقات

کہوں کیا شہرۂ آفاق ہے وہ ۔ نہایت آپ کی مشتاق ہے وہ
متانت حق نے دی ہے اس پہ اتمام ۔ سو مشہور اس کا اب متن ہوا نام

متیں ایسی ہی اور ایسی ذہیں ہے ۔ کہ اس کا فہم سب کی زہ نشیں ہے
ہو اسبابِ نشاط اس سے مہیا ۔ کہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ پیدا

شعور اپنے ہے فن کا اس قدر یاد ۔ کہ جانے تانسین اب اس کو استاد
کہوں میں انجمن کی اس کے کیا بات ۔ فلاطوں بھی کہے ہے یہ طلسمات

جمال ایسا جو دیکھے دور سے ماہ ۔ فلک سے پھر اسی کے گھر کی لے راہ
فروغِ بزمِ مہرویاں ہے گویا ۔ سراجِ محفلِ خوباں ہے گویا

جو کہیے تو بلا بھیجیں اسے ہم ۔ خوشی سے تا گذر جاوے کوئی دم
اسے منظور ہے کرنی ملاقات ۔ کہا خواجہ نے پس بہتر ہے یہ بات

کریں گے خوبرویوں کی ذرا دید ۔ غنیمت ہے کوئی دم دید وادید
انھوں نے موجبِ ارشادِ حضرت ۔ بلا چیلے کو فرمایا کہ دولت

کسی کو کہہ کہ اب متن کے گھر جاوے ۔ شتابی اس کو اور راحت کو لے آوے
یہ سن کر آدمِ سرکار نے جا ۔ درِ دولت پہ وہیں لا اتارا

پھر آئی اندرونِ خانہ وہ ماہ ۔ کہ ایک ایسی پری تھی جس کے ہمراہ
کرے بیدار ایک ٹھوکر سے یارو ۔ وہ مہ خوابِ عدم کے خفتگاں کو

فدا ایک ایک دری ہو اس صنم پر ۔ یہ تھی اٹکھیلیاں ہر ہر قدم پر
غرض چہرے پہ تھی ایسی ملاحت ۔ کہ دیکھے سے ہو زخمِ دل کو راحت

سحر جو نیند سے آنکھ اس کی کھل جاوے ۔ فلک آئینۂ خورشید دکھلاوے
جہاں میں غیرتِ مہ وہ پری ہے ۔ کہ زہرہ بھی اسی کی مشتری ہے

ہے سبزہ رنگ اس کا اس قدر سبز ۔ کہ ہوئے گلشنِ حسن اس سے سرسبز
زمیں پر تھی قدم رکھنے کی یہ چال ۔ کہ ہوتے تھے دلِ عشاق پامال

قدم جس وقت پڑتا تھا زمیں پر ۔ تو رخشِ ناز تھا چرخِ بریں پر
ادا و ناز سے کر دل کو مائل ۔ غرض آئی وہ در سے تا بہ محفل

سلامِ ناز کر کے آن بیٹھی ۔ جگہ کر دل میں مثلِ جان بیٹھی
کہوں کیا دیکھتی ہی اس کی صورت ۔ ہوا خواجہ کو میلانِ طبیعت

بیاں تک اس کی تھی تقریر قاتل ۔ کہ بس باتوں ہی باتوں میں لیا دل
وے تھی ساتھ جس کے وہ پری رو ۔ کھڑی دیکھی تھی وہ حضرت کے منہ کو

یکایک ہو کے سنمکھ عرض یہ کی ۔ بہت تھی آپ کی مشتاق بندی
مجھے تھا دیکھنے کا شوق ہر وقت ۔ سو دیکھا آج تھا موقوف بر وقت

نہایت شاد و شادابِ دل میں ہوں میں ۔ ہوئی ہوں جس قدر خوش کیا کہوں میں
قدم بوسی کی مجھ کو آرزو تھی ۔ سو بر آئی وہ اب جو آرزو تھی

وہ سب تقریر کی جو دلبری کی ۔ کہا حضرت نے یوں اس سے سنو جی
یہ خوبی ہے تمہاری جو کہا سب ۔ وگرنہ میں ہوں ایک جز ضعیف اب

کرم اب آپ کا اس پر بجا ہے ۔ کہ ہو تم شاہِ حسن اور یہ گدا ہے
یہ مضموں مصرعۂ شاعر کا سن لو ۔ عجب کیا گر نوازے شہ گدا کو

شب ان باتوں میں گذری اور ناگاہ ۔ ہوا پیدا پھر آثارِ سحر آہ
تو سر دفتر نے اس کے وقتِ رخصت ۔ کہا حضرت کی خدمت میں محبت

کرم گر گھر میں عاجز کے کرو گے ۔ قدم تو میری آنکھوں پہ دھرو گے
سخن اس نے کہا جو یہ بہ تکرار ۔ کیا خواجہ نے پھر آنے کا اقرار

یہ کہکر گھر گئی وہ غیرت ماہ   لے اُس رشک قمر کو اپنے ہمراہ
گئی دن بعد حضرت کی ہوئی رائے   کہ چلئے واں جہاں اُس مہ کی ہے جائے
یکایک اُس پری کے گھر کی لی راہ   وہیں جا پہونچے پھر تا منزل راہ
سمجھکر صاحب خانہ نے تکریم   کی اُٹھکر سرو قد حضرت کی تعظیم
کہوں کیا صاحب خانہ کی میں بات   کیا جو کچھ کہ تھا حق مدارات
جسے دیکھا وہاں وہ گلبدن تھا   غرض وہ گھر نہ تھا رشک چمن تھا
نظر واں آئے اور ایسے پریزاد   قد موزوں ہیں جن کا رشک شمشاد
کروں میں گر سخن کی مشق صد سال   نہ ہو اُس کا بیان وصف یک خال
یہ گرمی تھی سراسر چشم بد دور   بجا ہے گر کہوں میں شعلۂ طور
تھی اُس حسن انور کا بیاں ہو   جو میرا انوری بھی ہمزباں ہو
کروں پردہ کیا تعریف اُس کی   کہ ہے اُس نازنیں کا نام بخشی
عجب بخشی کہ ہے جاں بخش عالم   ہو اُس سے جان بخشی دل کو ہر دم

سراپا

سراپا کا بیاں کیا کیجئے یاراں   کہ ہے اب غیرت یوسف وہ جاناں
جو کرتی دید تو کہتی زلیخا   نہ دیکھا خواب میں ایسا سراپا
خدا کا نور ہے اُس کا سراپا   سراپا نور ہے اُس کا سراسر
ہیں اُس کے موئے سر سر رشتۂ جاں   درازی دے خدا اُن کو ہر ایک آں
جو ہے عشاق پر اُس کی سیاہی   سو دیتی ہے شب یلدا گواہی
دہان غربت میں ہو دے خضر کو شام   سیاہی اُس سے لے ظلمات ہر دوام
جو وہ کر شانہ تک وہ رشک مہتاب   بناوے پٹیوں کی اپنے محراب
تو سجدہ ہی کرے پھر آن کر شیخ   اُسے محراب کعبہ جان کر شیخ
یہ دیکھ اُس مانگ کو آیا نگہ میں   ہے گویا کہکشاں شام سیہ میں
گہر تھی مانگ میں ایسی ہی ڈھب سے   کہ جوں چمکے ہیں تارے نیم شب سے
خجل بالوں کی بو سے مشک و عنبر   اُسی سے حال ہے سنبل کا ابتر
غرض وہ سر ہے اُس رشک پری کا   کرے کون اُس سے دعویٰ ہمسری کا
جو سر پر اوڑھنی اوڑھے وہ گلنار   جدا ہر مو ہو اُس دم یوں نمودار
کہ جوں زیر شفق گردوں پہ باراں   رگ ابر سیہ ہووے نمایاں
گندھی چوٹی کچھوری تھی بہ این اوج   کہ کالی ناگنی جوں لہرائے ہے موج
ولیکن اُس کا یہ کیا وصف ہے گا   وہ کوہ حسن کی چوٹی ہے گویا
نہ کیوں کر دست شانہ زور پاوے   کہ ہے چوٹی پری کی ہاتھ اُس کے
جو جوڑا باندھتی بالوں کا وہ ماہ   پڑیں عقدیں ہزاروں دل میں ناگاہ
سماں ایسا ہی ہو اُس وقت یارو   پس خورشید جو ابر سیہ ہو
جو ٹک پھر پیٹھ پر چھوڑی وہ دھنا   تو پاوے تازیانہ توسن ناز
دل صد چاک کو ہے دھیان اُس کا   کہ ہو شانہ کسی عنوان اُس کا
قد و زلف اُس کی پر جس کی نظر جائے   درازی زلف کی سی دل میں یہ آئے
ازل کے باغباں کا ہے عجب کھیل   کہ سنبل کی نکالے سرو سے بیل
جبیں اُس کی بہ از ماہ فلک ہے   کہ اُس میں مہر سے افزوں چمک ہے
کرے جو اُس پہ ٹیکے کا نظارا   تو گویا چاند پر دیکھے وہ تارا
کوئی ہمسر نہیں واللہ اُس کا   کہ ہے داغی غلام ایک ماہ اُس کا

اُسے اِس واسطے مہ سی شرف ہی کہ اُس میں ہی کلف یہ بے تکلف ہے
کیے وصف اُس کا کیا یہ ہمتِ پست کہ ہی وہ دستِ قدرت کے کفِ دست

جبیں پر اُس کے نقشہ ابرؤں کا کروں تجھ سی بیاں ای دل سو ہیں کیا
مصوّر نے جو دیکھی جائے خالی دو خط مہ پر یہ کھینچے ہیں ہلالی

جو تیغ اُن ابرؤں کو کیجے تقریر (ربط) بیک جنبش کریں وہ کارِ شمشیر
کمانِ قوس اُنھیں کہتا ہی آفاق زبس وہ فن خونریزی میں ہیں طاق

ولے قوسِ قزح کو چرخِ گردان کرے ہی ابرؤں پر اس کو قربان
جو ٹک اُن ابرؤں کو دیکھ پایا ہلال اپنے تئیں مہ نے بنایا

کہ شاعر مجھکو دیں تا اُس سی نسبت مہِ نو کو ہی پر کیا اُس سی نسبت
مہِ نو ابروئے پیرِ فلک ہی کہاں حسنِ جوانی کا نمک ہی

وہ ابرو میں جو ہی ایک نقطۂ خال سُن اب تقریر اُس کی مجھ سی فی الحال
جو سیدھا کرکے اُس کی خط کو پڑھیے تو ایک پڑھنے میں ری آتی ہی ایک نری

دو ابرو دیکھ کر جاتے رہے ہوش کمانیں ہیں کشیدہ گوش تا گوش
(در کان) دو گوش اُس کے ہیں ایسے غیرتِ گل چراغِ گل ہو جن کو دیکھکر گل

ولے دوں گل سی نسبت اُن کو کیوں کر کہ ہیں یہ گوش شنوا اور وہ ہیں کر
سُنو ایسے پُر از گوہر ہیں دو کان مقابل جو صدف ہو کیا ہی امکان

صدف جو تہ نشینِ بحر ہے آہ میں اُس کی وجہ سی ہوں خوب آگاہ
یہ اُن کانوں کا ہی اُس کو خیال اب کہ ہی نت غرقِ آبِ انفعال اب

کسی سے کیوں کہ دوں میں اُن کو نسبت کہ اُس کی کان ہیں کانِ ملاحت
نیں اب تھرتھری جاتی ہی خور کی چمکتے کان میں دیکھ اُس کی مُرکی

اور اُس مُرکی کے ہر سو موتی ایسے ستارے ماہ کے ہوں گرد جیسے
کرن پھول اُس کی کانوں میں ہے ایسا کنول سے وہ کنول نکلا ہے گویا

اُتر آوے ابھی دیکھ اُس کا بالا اگر گھیرے رہی مہ کو نہ ہالا
ہن ہالا اُسی کے غم میں ہی ماہ فلک پر حلقۂ ماتم میں ہے ماہ

جو اُس پری نے کان اپنے میں ڈالا وہ بالا کیوں نہ دیوے سب کو بالا
وہ بحرِ حسن کا ایسا ہے قلاب کہ ہی ایک ماہیِ حسن اُس میں بیتاب

دُرِ گوش اُس کا تھا ایسی چمک پر نہ چمکے صبح کا تارا فلک پر
ولے تارے سے نسبت کیا ہی اُس کو کسی عاشق کا دل لٹکے ہی یارو

وہ ایسا بے بہا ہے کیجو باور کہ جیسی ہو صدف میں ایک گوہر (در گوہر)
ہوا اشک اِس دیدۂ گریان کا دُر جو روؤں یاد کر اُس کان کا دُر

نئے نرگس سے گر میری قلم ہو تو اُن آنکھوں کی خوبی کچھ رقم ہو
ولے نرگس کو نسبت اُن سی کیا ہے نگہ جادو ہی اور چتون بلا ہے

ہی نرگس اُن کی آگے چشم حیران کہ ہیں وہ انکھڑیاں رشکِ غزالان
سیاہی اور سفیدی سب دل افروز ہم ایک جا نظر آئے شب و روز

بلا ہے سحرِ مردم چشم بد دور کہ پیدا ہوئے ہی ظلمات سے نور
یہ آنکھوں میں ہی سُرخی می سے ہے کہ ہوں کیفی بیاں اُس کے کئی سے

ہی اُس کے دور میں صوفی بھی مے نوش پھرے ہے محتسب بھی مست مدہوش
وہ ہیں بد مست اور مژگاں ہیں خنجر بھلا اب خونِ مردم ہو نہ کیوں کر

ہوئے گوشہ نشیں سب مست و ہشیار کہ ہیں یاں ہاتھ میں کیفی کی ہتھیار
نگہ کا ٹک اگر بھالا سنبھالیں جدھر بیٹھیں وہیں بس مار ڈالیں

قضارا وہ جو تیرِ غمزہ چھوڑیں تو پھر مرگ و قضا بھی منہ کو موڑیں
دعا میری ہے یہ شام و سحر کی نہ ہو یا رب نظر اُن کو نظر کی

کہے اُن کے اشارے کی وہی بات — پڑھی جو حکمت العین اور اشارات
غرض وہ ترک چشم ایسی ہیں خونخوار — کریں ہیں خونِ ناحق دن میں سو بار

ابھی بلوائے خونِ مردماں ہو — جو حق بینی نہ اُس کی درمیاں ہو
غلط ہے چہرہ اُس کا گلستاں ہے — وہ بینی خندۂ گل درمیاں ہے

نہیں سوجھی مجھی کو کچھ یہ صورت — گواہ اس قول کا ہے شعر حشمت
بگلشن غنچہ با ایں خوش نشینی — بہ بینی غیر آں بینی نہ بینی

جو مجھ سے پوچھو تو سوجھا ہے کچھ اور — کہ اوپر لب کے ہے بینی کا یہ طور
کہا چاہے تھا کچھ عاشق سے مطلب — سو لایا حسن اب انگشت تا لب

دو نتھنوں کی پھڑک اب کس کو دے چین — دلِ عاشق کے دو ٹکڑے ہیں بے چین
اور اس نتھ کا ہے حلقہ زنخ پہ یوں آہ — کہ جیسے ماہ کے اندر جدا ماہ

وہ نتھنا دیکھکر دولت کا ایک در — ہوئی نتھ حلقۂ در اُس کا آکر
تمنا میں اُسی کے آہ غم سے — پڑے ہیں دیدۂ عاشق میں حلقے

ہیں اُس کے موتی ایسے پیارے پیارے — کہ جوں آجائیں ہالہ میں ستارے
ستارے بھی ہیں اور طرفہ ہے بلکہ — کہ جیسے پارۂ تھر اُن میں ہر ایک

ہوا زر اتنی ہی خاطر گداز اب — کہ تا نتھ ہو کے پہونچوں اُس کے تا لب
نہیں وہ لب ہیں لعلِ بیش قیمت — وے کب لعل میں ایسی ہے رنگت

دو دل اب غنچے کو نسبت کیوں کہ ہے ننگ — نہیں ہے رنگِ لعل اُس لب کے پاسنگ
وے غنچہ ہے کیا اور اُس کا کیا لب — وہ لب ہے حسن و خوبی سے لبالب

جہاں ہیں شور سن کر اُس کے لب کا — گیا چرخِ چہارم پر مسیحا
جو لب انگر صفت اُس یار کا ہے — اُسی میں چشمۂ آبِ بقا ہے

کہوں یاقوت یا گل یا کہ صہبا — ہوئے ہیں آب و آتش جمع یکجا
دے اُس لب کے تئیں شہد و شکر باج — دُرِ دندان کو سلکِ گہر باج

یہ اُن میں ہے چمک اور آبداری — کہ اُس سے برق کو ہے بیقراری
مسی آلودہ لب گر وہ دکھاوے — گلِ خیرا کو خوبی بھول جاوے

نہ تنگیٔ دہن کا کچھ بیاں ہو — دہن میں غنچہ ساں گر سو زباں ہو
چمن میں کچھ جو بات اُس کی چلی تھی — تو پھر ہر ایک کلی کو بے کلی تھی

دہن کو بے نشاں سن سب ہیں خاموش — مگر اُس کی زباں ہے سر بسر نوش
زنخ اُس کا ہے باغِ حسن کا سیب — وے ہی اُس کی آگے کیا بلا سیب

کہیں یہ سے ہے بہتر وہ زنخ یاں — کہ خوانِ حسن کا ہے یہ نمکداں
ہوا جو یوسفِ دل گم عزیزاں — وہ تھا چاہِ زنخ میں اِس کے پنہاں

نہیں وہ چاہ چشمہ حسن کا ہے — نہیں ہے چشمہ گردابِ بلا ہے
ہوئی غبغب سے خوبی اُس کی دونی — فقط یہ حسن ہی کی ہے فزونی

وہ گردن گردنِ مینا ہے یارو — کرے خم گردنِ گردن کشاں کو
صفائی اُس کی یوں یوں دکھائی — صراحی بن کے جوں خود صبح آئی

نمایاں رنگِ پاں یوں اُس گلے سے — کہ جیسے ڈانگ گوہر کے تلے سے
اگرچہ اُس میں چکنی ہی بھلی ہے — گلے کے ہار پر چمپا کلی ہے

گلے کے کچھ نہیں موتی فقط ہار — پڑا آ کر گلے اُس کے چندن ہار
چندن ہار اب نہیں ہے پارۂ دل — کہ رہتے ہیں گلے میں نت حمائل

ذرا بازو کا دیکھو کیا برن ہے — کہ یہ بازو پہ اُس کے نورتن ہے
ہے اُس کا غیرت گلزار ساعد — کہ ہے شاخِ گلِ بے خار ساعد

سنی جو ٹک نزاکت اُس کی ہم سے — رگیں گل کی نکل آئی ہیں غم سے
ملائم یاں تلک ہے وہ کلائی — کہ جس نے آبِ رگِ گل بھی بھلائی

پھر اُن میں حلقۂ زریں پڑا ہے   تو کہتے ہیں اسی خاطر کڑا ہے
جو زیور اُس کلائی میں پڑا ہی   جہانگیری کا نام اُس کو ملا ہے
کفِ دست اُس کی سے خورشید شرمائے   شعاع اُس کی رگوں میں صدقے ہو جائے
کہوں اوصاف کیا رشکِ چمن کے   سرِ انگشت پر اُس گلبدن کے
حنا کا رنگ تھا ایسا ہویدا   کہ جو غنچہ ہو شاخِ گل سے پیدا
بہارِ سینہ و پشت و دو پہلو   کہوں کیا رشکِ گلشن ہی وہ گلرو
یہی اب چار سو رہتی ہے تکرار   کہ باغِ حسن کے ہیں یہ چمن چار
کٹوروں میں کچوں کو کیا کہوں میں   کہ ہیں دو سیب یا یہ سنگترے ہیں
کسی نے یاد کا کر کے بہانہ   رکھا ہی ڈھانپ امرت پھل دوگانا
کچھ ایسی لگتی ہیں وہ پیاری پیاری   کہ دیکھے سے ہو دل کو بیقراری
یہ ہی لطف اُن پہ اب جس کی نظر جائے   تو دل کو تھام کر ہاتھوں سے مر جائے
کری ہے قصدِ دید اب چشمِ بے نور   اصم چاہے کہ سُنئے اُس کا مذکور
لگی ہی دھکدھکی چھاتی پہ آ چرچ   کہ چھاتی سے لگا آ کیوں کے سورج
اب اُس موئے میاں کا کیا بیاں ہو   بیاں تب ہو جو کچھ بھی درمیاں ہو
قیاس اب کر کے سمجھے وہمِ انساں   کسی عاشق کی ہی شاید رگِ جاں
ولے کیا کہیے اُس کا وصف یا رو   عدم کی بات ہے معلوم کس کو
شکم تا سینہ لوحِ صاف ہی ایک   جو ہی اُس میں تو نونِ ناف ہی ایک
اب آگے کیا کروں تحریر و تقریر   کہ ہے دستِ حیا میرا گلوگیر
مگر اُس کے سُرین کو دیکھ شیریں   کہے ہی پُر شکر وہ تنگِ شیریں
کہیں زانو کی جو دیکھی صفائی   لئے کاسہ کرے ہے مہ گدائی
وہ زانو اُس کا ہے گنجینۂ حسن   کہ ہو حیران دیکھ آئینۂ حسن
نہیں مذکور گر اُس کا پری رو   ادب سے وو ہیں ہو بیٹھیں دو زانو
رکھے ہی معجزہ ایسا ہی وہ ساق   عصائے موسوی ہی جس کا مشتاق
رسائی کب ہی دستِ فہم کو واں   لکھوں کیا وصفِ پشتِ پا کا یاراں
نگاہِ چشم اُس صاحب حیا کی   ہوئی ہی آپ عاشق پشتِ پا کی
کہوں اُس سرو کی خلخال کیا ہے   یہ عکسِ طوقِ قمری آ پڑا ہے
بیاں کب ہو سکے رنگِ کفِ پا   جگر خوں کر دیا رنگِ حنا کا
قدمبوسی کی ہے وہ آرزو میں   جو ڈوبا پنجۂ مرجاں لہو میں
کفک پاؤں کی ایسی چہچہی لال   کیا ہی خوں ابھی گویا کہ پامال
کروں فندق سی کیا انگشتِ پا سرخ   نہیں دیکھا کسی نے مو گرا سرخ
سر و پا کا بیاں سب کچھ کیا میں   جو کچھ دیکھا تھا اُس میں سو کہا میں
سراپا کی یہی تاریخ نکلی   ہوا ہے دیکھ لو اوصاف بخشی
تصدق اُس پہ ہو خوبی چمن کی   نزاکت کیا کہوں اُس گلبدن کی
پھرے گردش گل پر با تجمل   چبھے جوں خار پاؤں میں رگِ گل
گھر اُس کا کیوں نہ اب رشکِ چمن ہو   خراماں اُس میں جو وہ گلبدن ہو
جو دیکھے تو نہ سرگرداں سے بلبل   کہ ہر ایک نقشِ پا ہی صورتِ گل
سراپا تھی وہ جیسی غرقِ زیور   نہ چمکیں اس قدر گردوں پہ اختر
یہ پوشاک اُس کی سے شرمائی ہی برق   جو پیدا ہو کے پھر چھپ جائی ہے برق
بیاں کب ہووے وصفِ قد و قامت   قیامت ہے، قیامت ہے، قیامت
خرام اب کیا کہوں اُس فتنہ گر کا   کہ تھا ہر ایک قدم پر حشر برپا
یہ اٹکھیلی سی تھی اُس شوخ کی چال   ہوا کی موج کو کرتی تھی پامال
سمندر میں یہ سُن کر شور اُس کا   چلی جاتی ہے بھاگے موجِ دریا

کہوں کیا گفتگو کا تھا یہ انداز — کہ تھا ہر ایک سخن میں عشوہ و ناز — یہ با تمکین تھی وجہ کیا کیجے تقریر — کہ گویا تھی سراپا شکلِ تصویر

کروں میں تا بکے اوصاف اُس کا — کہ دُور از فہم ہی اوصاف اُس کا — نہیں تقریر کا یارا زباں کو — شروع اب یاں سے کیجے داستاں کو

اگرچہ داستاں ہی داستاں میں — غرض دیکھا اُسی بھی اُس مکاں میں — وہ گرچہ دلدہی کی تھی سزاوار — پہ حضرت کو نہ تھا اُس سے سروکار

اُنھیں تھا جس پہ میلانِ طبیعت — اُسی سے کر رہے تھے بات حضرت — اُسے دیکھی سے تھا آرام راحت — کہ ہی مشہور اُس کا نام راحت

زبس راحت کی ہی دل کو جو تھی چاہ — کیا حضرت نے قصداً اُس سے اکراہ — پھر اُن کو جو ہوا واں آب مطلوب — وہی لائی جسے سمجھے تھے معیوب

بلانے جب لگی وہ غیرتِ خور — کیا حضرت نے واں اُس سے تنفر — مکرر گرچہ لائی جام وہ ماہ — ہوا اکراہ پر اور اُن کو اکراہ

نہ تھا اکراہ جو اُس سے سزاوار — تو وہ انکار تھا در پردہ اقرار — کیا معلوم جو اُس نے وہ اکراہ — ہوئی شدت سے بیچاری خجل آہ

جو دیکھی اُس نے یہ نا مہربانی — خجالت سے ہوئی وہ پانی پانی — یکایک ایسی ہی چتون بنائی — کہ دل پر کر گئی وہ دلربائی

توجہ کی نہ جو خواجہ نے مطلق — تو آئی جوش میں بس غیرتِ حق — غرض تھا جس قدر پانی سے اکراہ — دو چنداں دل کو در پردہ ہوئی چاہ

وے پھر آئے حضرت گھر کو ایک بار — سبھوں سے کر کے پھر آنے کا اقرار — گئے وعدے پہ جو بعد از دو سہ روز — تو ناگہ لگ گیا تیرِ جگر دوز

ادب سے صاحبِ خانہ نے آ کر — سلام اُن کو کیا سر کو جھکا کر — کہا بعد از سلام اُس نے کہ حضرت — کہو تو گائیں کچھ بخشی و راحت

ارادہ تھا یہی مدت سے میرا — کریں یہ سامنے حضرت کے مجرا — تو پھر خواجہ نے فرمایا یہ سُن کر — یونہیں مرضی تمھاری ہے تو بہتر

پھر اُس نے موجبِ فرمانِ عالی — برائے رقص ایک جاگہ کی خالی — بچھایا فرش ایسا حسبِ دلخواہ — خجل ہو دیکھ کر جس کو شبِ ماہ

کہ رشکِ چاندنی ہر جا چاندنی تھی — یہ از بہر اُس پہ یک مسند بچھی تھی — رکھی ایک شمع لا ایسی ہی ناگاہ — کہ گل ہو دیکھ جس کو مشعلِ ماہ

پھر اُس جا لا کے خواجہ کو بٹھایا — اور اُس رشکِ پری کو بھی بُلایا — تو ناگہ آئی واں وہ غیرتِ ماہ — اور اُس کی بھی بہن راحت تھی ہمراہ

کہی پھر صاحبِ خانہ نے یہ بات — یہی غم مجھ کو اب رہتا ہی دن رات — کہ صورت اور سیرت اس کی ہی خوب — وے کم شہرتی سے ہی یہ محجوب

توجہ جیسی ہی راحت پہ حضرت — کرو اس پر بھی تا ہو اس کی شہرت — جو اس پر آپ کا اشفاق ہووے — ابھی یہ شہرۂ آفاق ہووے

رکھو اپنی سدا اِس پر توجہ — کرو بہرِ خدا اِس پر توجہ — سوال اُس کا جو عاشق نے سُنایا — تو پھر سُن کر جواب اُس کو دیا یہ

جو ہوں ہم اپنی بیگانوں میں رسوا — تو شاید اِس کا بھی ہو جائے شہرا — وے رسوائی سے کب ہم کو ہی عار — غضب یہ ہی کہ تو بھی ہوگی بیزار

تجھے آنا ہمارا بار ہوگا — اُٹھانا یاں سے پھر دشوار ہوگا — تجھے اب جس قدر ہی ہم سے الفت — زیادہ اِس سے بھی ہوگی عداوت

پھر اس صحبت سے تو بیزار ہوگی — میری صورت سے تو بیزار ہوگی — جتاوے گی یہ ایما و اشارا — کہ حضرت کیجے اب یاں سے کنارا

قیاس اب چاہی ہے یہ تجھکو دن رات گمانِ بد سے گزریں گے خیالات
یہ سُن کر صاحبِ خانہ نے تقریر کہا حضرت نہیں ہیں ایسی بے پیر
جو تم پر یہ خیالِ بد کروں گی خدا سے کیا نہیں اپنے ڈروں گی
قطعہ
یہ سمجھو مت گئی ہیں تم پہ واری کہ جان و دل سی خدمت میں تمہاری
رسوخیت ہی مجھکو او ارادت جو تم یاں آؤ ہی میری سعادت
جو حرفِ گرم کچھ مُنہ سے نکل جائے زباں میری برنگِ شمع جل جائے
خیال ایسا نہ ہرگز دل میں تم لاؤ یہ گھر ہی آپ کا یاں شوق سی آؤ
یہ کہکر پھر کہا اُس مہروش کو شتابی اب تو مجرے کو کھڑی ہو
طبیعت اُس کی گانے پر جو آئی کہوں کیا عالمِ نغمہ سرائی
بیاں اُس کی زباں سی تان سُن کر فلک پر دیدۂ زہرا ہوا تر
تھی ہر ایک تان اس انداز کے ساتھ چلا جاتا تھا جی آواز کے ساتھ
کہوں گر لحن داؤدی بجا ہے کہ ہر آہن کو موم اُس نے کیا ہے
نہیں گر رہت کرتا میں یہ مذکور تو کیوں غل کر رہی ہیں تارِ طنبور
یہ کیفیت دکھائی اُس صنم نے کیے دل کھول نالے زیر و بم نے
سُنے گر سات سُر کی تال کا چل عجب کیا سُرتی ہی جائے بلبل
یہ علم اب اُس کو موسیقی کا ہی یاد جو ہوتے دیوتا تو کرتے اُستاد
سرود ایسا کہوں کیا رقص کی بات بیاں کب ہو سکیں مجھسے وہ حرکات
کہ مرغِ روح سن گھنگھرو کی آواز دلِ صد چاک سی کرتا ہے پرواز
جو گھونگھٹ میں رُخ اُس کا ٹک نہاں ہو تو گویا مہر زیرِ سائباں ہو
ادا ٹھوکر سے تھی ایسی نکالی کہ تھا دیکھ اُس کو حیراں نقشِ قالی
غرض لگتی تھی ٹھوکر اِس ادا سے عیاں محشر تھی گھنگھرو کی صدا سے
یہ وقتِ رقص سمجھے جو ہو ماہر ہی اُس کے بھاؤ بتلانے سے ظاہر
خریداروں کو کہتی ہی کہ اب جاؤ متاعِ حُسن کا ہی کچھ بڑا بھاؤ
لچکنا ہاتھ کا کیا کہیئے یارو نہ لغزش شاخِ گُل کی پہنچے اُس کو
کبھو جاتا جو تھا بالائے سر ہاتھ تو پھر دیکھی تھی خود اُس کی نظر ہاتھ
یہ بیتابی تھی دل کو اُس کے بھی آہ کہ سینہ ہاتھ سے تھامی تھی وہ ماہ
کبھو گردش میں جو آیا تھا داماں کہ اُس پہ گردشِ گردوں ہو قرباں
جو دیکھے اُس کی سنگت اور اُس کو تو اِندر کا اکھاڑہ بھی خجل ہو

اب اس قصّے کا یاں سے یوں بیاں ہے سنو یارو عجائب داستاں ہے
سرود و رقص جب عاشق نے اُس کا سُنا کانوں سی اور آنکھوں سی دیکھا
یہ نکلا منہ سے یارب کیا کروں میں دیا دل ہاتھ سی اب کیا کروں میں
ہوا تھا یا تو پہلے ایسا اکراہ کہ پانی ہاتھ سے پیتے نہ تھے آہ
ہوئی اُس کو بدل یہ بے قراری کیا دریائے خوں آنکھوں سے جاری
کیا راحت نے بس دل سے کنارا یکایک بحرِ غم نے جوش مارا
ہوئے تھی حلقۂ چشمان پُر نم برنگِ حلقۂ گرداب اُس دم
ہوا جوں موج پیچ و تاب دل کو کیا غم نے گلا کر آب دل کو
ہوا سینے میں یہ کچھ حال دل کا کرے ہے شور جیسے قعرِ دریا
جگر تک ہو گیا سب پانی پانی ہوئی تھی سخت مشکل زندگانی
ہوا ایسا ہی بس اشکوں کا طغیاں کہ آیا چشم کی کشتی پہ طوفاں
دل و جان و جگر پر بے تامّل غم و درد و الم کا بندھ گیا پل
ہوا دشوار دم لینا اِس اسلوب کہ جوں دریا میں جاتا ہی کوئی ڈوب
یہ بر میں تھا دلِ بیتاب کا حال کہ ہو جوں ماہیِ بے آب کا حال

چلے جو اُٹھ کے واں سے اپنے گھر کو   تو پھر پھر دیکھتے تھے اپنے در کو
قدم یوں طے نہیں سکتے تھے کر راہ   شناور جوں بھنور میں جا پڑے آہ
گئے گھر میں تو تھے اس طور مضطر   قفس میں جیسے ایک بلبل ہو بے پر
غم و اندوہ سے تھا کام دل کو   کسی صورت نہ تھا آرام دل کو
بہائے چشم پرنم نے یہ آنسو   کہ دریا بہ چلے پلکوں سے آنسو
نہ دل کو چین تھا نہ چشم کو خواب   کٹی آنکھوں میں شب جوں چشم مہتاب
غرض دن رات گذرا بیکلی میں   یہی کہتا تھا دل چل اُس گلی میں
ستانے جب لگا دردِ جدائی   وہیں جانے کی دل میں لہر آئی
تو پھر دونوں جہاں سے کر کنارا   گیا اُس آستانے پر گزارا
دو بارا جب ہوئی آپس میں صحبت   بڑھی دونوں طرف سے دل کی الفت
نشست اُس جا لگی ہونے شب و روز   کہ تھی جس گھر میں وہ شمعِ دل افروز
جو ہوتی تھی جدائی ایک ساعت   تو دل کی کچھ عجب ہوتی تھی حالت
تڑپتا تھا دلِ بیتاب بر میں   نہ جاویں جب تلک پھر اُس کے گھر میں
بغیر اُس کے کہیں لگتا نہ تھا دل   ہوا تھا آہ ایسا مبتلا دل
بہم ہوتی تھی جوں جوں گرم صحبت   زیادہ دن بدن ہوتی تھی الفت
وے تھی دیکھنے کی آشنائی   سدا تھی مثلِ آئینہ صفائی
خموشی تھی گہے اور گاہ باتیں   سدا یوں وصل کی کٹتی تھیں راتیں
کٹا جب یوں قریب ایک سال کے آہ   اثر معشوق کو کرنے لگی چاہ
ہوا دل اُس کا اُلفت سے خبردار   نمایاں عشق کے ہوتے تھے آثار
کسی سے وہ پری کرتی نہ تھی بات   کسی کی خوش نہ آتی تھی ملاقات

یہ سچ ہی ہو کسی پر جو کہ شیدا   تو ہو معشوق کو بھی اُنس پیدا

بیانِ عشق یاں سے یوں ہے اب آہ   عزیزو کیا کہوں احوالِ جانکاہ
قلم کو بھی نہیں طاقت رقم کی   کہ اب چھاتی ہی پھٹتی ہے قلم کی
مجھے بے اختیار آتا ہے رونا   کہ ہوتا ہے جو ہو قسمت میں ہونا
مبدّل دوستی کا ہو گیا طور   یکایک رنگ بدلا چرخ نے اور
مجھے کیوں کر نہ اِس جا آئے گریہ   کہ یہ احوال ہے اب جائے گریہ
سنے گر سنگ بھی ہو جائے پانی   کہ ہے آفت زدوں کی یہ کہانی
یہ چرخِ تفرقہ پرداز ناگاہ   ہوا تک اُن کی صحبت سے جو آگاہ
ملاقات اُن کی گردوں کو نہ بھائی   تو صبحِ وصل کی یہ شامِ جدائی
یہی روزِ ازل سے اُس کی ہے چال   جو مفسد ہیں رکھے ہے اُن کو خوشحال
بڑا مفسد ہو جو اور مفتری ہو   یہ چاہے ہے اُسی کی بہتری ہو
غرض اس بات سے حاصل ہے یہ آہ   ہوئی جب عاشق و معشوق میں چاہ
تو جو تھے مفسد و غمّاز بیہات   نہ چاہا یہ رہے باہم ملاقات
کہا یوں نایکہ سے اُس کے یکبار   ذرا تو اپنے گھر سے ہو خبردار
خبر ہم کو ہے اور تیرا یہ گھر ہے   تجھے بھی اپنے گھر کی کچھ خبر ہے
ہوا چاہی ہے اب خانہ خرابی   خبر گھر کی شتابی لے شتابی
تری گھر میں جو یہ ایک نازنیں ہے   سو وہ اب حکم میں تیری نہیں ہے
ترے گھر میں جو یہ آتے ہیں حضرت   ادب کرتی ہے تو جن کا نہایت
خدا جانے اُنھوں نے کیا پڑھایا   جو اُس نے ساری عالم کو بھلایا
جو چاہی ہے کہ اب خوش گزری اوقات   تو کر موقوف حضرت سے ملاقات
نہ جانے گی ہماری سینہ سوزی   تو پھر موقوف ہو جاوے گی روزی

یہ اُلفت اُس کے جی میں جو سمائی ۔ کہاں سے ہووے گی تیری کمائی
اگرچہ پیش ازیں بھی تھی یہ تکرار ۔ یقیں آتا نہ تھا پر اُس کو زنہار
ولے ہیں فرقۂ نسوات ایسا ۔ ہے ناقص عقل ناقص دین ان کا
غرض جب نکتہ چینوں نے بھرے کان ۔ بنا کر دل سے ایک ناحق کا بہتان
تو سمجھی دل میں عقل و ہوش کر گم ۔ نہیں گر کچھ تو کیوں کہتے ہیں مردم
لگی ایک بار کرنے چشم پوشی ۔ عوض باتوں کے ظاہر کی خموشی
خدا کے خوف کو دل سے بھلایا ۔ یہ ایما و اشارا یہ جتاتا
میری گھر کا بگڑتا ہے اب اسلوب ۔ جو حضرت تم نہ اب آؤ تو ہے خوب
جو پہلے بندگی تھی سب بھلائی ۔ وفا کے عہد پر کی بیوفائی
جو تھا خواجہ نے اوّل ہی جتایا ۔ تصدق ہو جئے وہ پیش آیا
کہا تھا یا تو اُن سے یہ کہ حضرت ۔ کرو بہرِ خدا تم اِس پہ شفقت
ہوئی یا یک بیک ایسی وہ بیزار ۔ کہ کرنا بات کا بھی دل کو تھا بار
کبھی جو بات کرتے تھے وہ اس سے ۔ تو یوں کہتی تھی یہ لوگوں سے گھر کے
رکھو تم جا کے سرگوشی پہ ٹک دھیان ۔ مبادا اور بھی اس کے بھریں کان
جو گزری اُس کے دل میں یہ خیالات ۔ ہوئی عاشق کو بھی معلوم یہ بات
جو اُس سے باغیوں نے کچھ لگایا ۔ تو ہم سے باغباں نے مُنہ پھرایا
کہا دل سے تجھے بھی غور کچھ ہے ۔ ہوا اب اس چمن کی اور کچھ ہے
ملاقات اس سے اب بہتر نہیں ہے ۔ چلو اب یاں سے یہ وہ گھر نہیں ہے
نہیں ہے اب ملاقات ان سے کچھ خوب ۔ نظر آتا ہے یاں کچھ اور اسلوب
یہ اپنے دل سے کر کر مشورہ آہ ۔ کہا پھر صاحبِ خانہ سے ناگاہ
اگرچہ میں تو شدت سے بُرا ہوں ۔ ولے یہ بات تجھ سے پوچھتا ہوں
میرے دل کو ہے جس کے ساتھ اُلفت ۔ صفائی سے ہے یا ہے با کدورت
تو سُن کر صاحبِ خانہ نے یہ بات ۔ کہا حضرت نہ لاؤ یہ خیالات
بزرگی کا تمہارے یہ یقیں ہے ۔ گمانِ بد ہمیں تم پر نہیں ہے
خدا و مصطفےٰ کی ہم کو سوگند ۔ علی مرتضےٰ کی ہم کو سوگند
نہیں ہے حرف بد کا ہم کو کچھ دھیان ۔ جو کہیے تو اُٹھا لیں اس پہ قرآن
کہا جس دم یہ اُس کی نایکہ نے ۔ تو یوں حضرت لگے اُس کو جتانے
نہایت عشق صادق میں اثر ہے ۔ اگرچہ اس کی تجھکو کیا خبر ہے
ولیکن قہر ہے تاثیر اُس کی ۔ بیاں کب ہو سکے تقریر اس کی
مبادا رنج معشوقہ کو ہو آہ ۔ اور ایذا تجھکو بھی ہو اُس کی ہمراہ
تو بس دی تو کئی دن ہم کو مہلت ۔ نہ پہونچے تا کسی کو کچھ مضرت
لگا ہے بے طرح سے دل ہمارا ۔ کریں آہستگی سے ہم کنارا
نہیں یکبارگی بہتر جدائی ۔ بلا ہے بد ہے تاثیرِ صفائی
اثر ایسا محبت میں ہے اس رنگ ۔ کرے پانی اگر ہووے دلِ سنگ
قیامت آہ کرتی ہے اثر یہ ۔ خبر تھی شرط سو کر دی خبر یہ
اب اس کو سچ سمجھ یا جھوٹ ہی جان ۔ غرض مختار ہے تو مان مت مان
یہ سب تقریر عاشق کی سُنی جب ۔ تو اُس کی نایکہ کہنے لگی تب
سُنو حضرت جی یہ کسبی کا گھر ہے ۔ ہزاروں عاشقوں کا یاں گزر ہے
ہزاروں لاکھوں یاں آتے ہیں عشاق ۔ ولے آنا تمہارا ہم کو ہے شاق
نہیں تاثیر کی ہم کو خبر کچھ ۔ نہ دیکھا اور نہ دیکھیں گے اثر کچھ
تکبر کرکے اُس نے جب کہا یہ ۔ تو خواجہ نے جواب اُس کو دیا یہ
گزارا عاشقوں کا یاں ہوا ہے ۔ کوئی عاشق نہیں تجھ کو ملا ہے

چلے لو اب تو یاں سے اپنے گھر ہم ۔ وے کرتے ہیں یہ تم کو خبر ہم ۔ کہ تم گر مبتلائے درد و غم ہو (ق) ۔ وگر دشوار لینا تجھ کو دم ہو

نہ کچھ سحر و افسوں ہم سے منسوب ۔ سمجھتے ہیں اسے درویش معیوب ۔ اگر بر حق ہیں اولادِ علیؑ ہم ۔ نہیں کرنے کے کام ایسا کبھی ہم

مگر یہ قلب کی تاثیر ہے وو[۱] ۔ مُبرّا قلب سے کہتے ہیں جس کو ۔ نہیں چارا کچھ اس سے ہم ہیں لاچار ۔ کیا اس واسطے تجھ کو خبردار

یہ کہکر پھر چلے واں سے جو ناگاہ ۔ کہوں اُس وقت کا کیا حال میں آہ ۔ ہوئی غائب جو محبوبہ کی صورت ۔ ہوئے آنکھوں سے جاری اشکِ حسرت

بلا موجِ حوادث دل پہ لائی ۔ ہوئی طغیان پر سیلِ جدائی ۔ قدم بیرونِ در رکھا جو ناگاہ ۔ کئی خدام تھے اُس وقت ہمراہ

مخاطب ہو کے اُن سے یہ کہی بات ۔ چھٹی اب اُس پری رو کی ملاقات ۔ ولیکن دل میں یہ گذری ہے خطرا ۔ نہ ہو دیوانہ پن کا اُس کے شہرا

مجھے دیوانہ پن کا اُس کے ڈر ہی ۔ نہ دیوانی ہوئی تو یہ خطر ہے ۔ کہ ٹوٹا کو وہ غم گر دل پہ یکبار ۔ تو ہو جاوے گا سِل کا اِس کو آزار

طبیب اب کوئی دیکھے گا جو حاذق ۔ کہے گا وہ کہ ہے اس کو تپِ دق ۔ جو اُس کا دیکھے گا حالِ زبوں آہ ۔ تو بھر لاوے گا وہ آنکھوں میں خوں آہ

غرض گریاں کناں چھوڑ اُس کے در کو ۔ بلاچاری چلے پھر اپنے گھر کو ۔ تو اُس دم بر میں تھا یہ دل کا احوال ۔ کہ ہو جس شکل سے بسمل کا احوال

طپش سے دل کے لرزہ تھا بدن کو ۔ کہ بیتابی ہو جوں شعلے کے تن کو ۔ بھرے تھے اشک خونی چشمِ تر میں ۔ دل ایک آتش کا پرکالا تھا بر میں

اٹھتا ہر جگہ پر تھا قدم ہائے ۔ چلے بیمار جوں لے لے کے دم ہائے ۔ یہی بات آئی تھی بس دل میں یکبار ۔ چھٹا افسوس ہم سے کوچۂ یار

ہوئی یکبار گی ایسی جدائی ۔ نصیبوں نے یہ کیا گردش دکھائی ۔ ہوئے ہم زیست سے مایوس افسوس ۔ گیا دل ہاتھ سے افسوس افسوس

بھرے تھے دیدۂ تر اشکِ خوں سے ۔ گریباں چاک تھا دستِ جنوں سے ۔ جو اُن کا حال دیکھے تھا سرِ راہ ۔ تو یوں کہتا تھا دل سے کھینچ کر آہ

نظر آتی نہیں اب زندگانی ۔ ہزار افسوس خواجہ کی جوانی ۔ طپش تھی دل میں اور سوزش جگر میں ۔ بہ ایں حالت وہ پہنچے اپنے گھر میں

گرے پھر بسترِ غم پر ہو بیتاب ۔ نہ دل کو صبر تھا نہ چشم میں خواب ۔ ہوئے بیتاب و تو ان و صبر رخصت ۔ ملے آ کر غم و اندوہ و محنت

قلق سے دل کے تھی یہ بیقراری ۔ کہ جوں حالت ہو وقتِ دم شماری ۔ کبھی گھر میں کفِ افسوس ملنا ۔ کبھی گھبرا کے پھر باہر نکلنا

کھڑے رہنا کسی رستہ پہ جا کر ۔ کہ شاید کوئی لے جاوے بلا کر ۔ نہ کل پڑتی جو مارے بیکلی کے ۔ تو جا جا گرد پھرنا اُس گلی کے

کبھی رو رو کے دردِ دل سنانا ۔ کبھی کچھ کہتے کہتے بھول جانا ۔ کبھی سو سو طرح کا دل میں تھا جوش ۔ کبھی ہوتا تھا وہ از خود فراموش

کبھی باتیں جو کچھ سو کچھ یاد کرنا ۔ تو رونا اور ٹھنڈی سانس بھرنا ۔ کبھی بستر پہ ایسا تلملانا ۔ کہ صدمہ روزِ محشر کا دکھانا

کبھی چپ دیکھنا مُنہ کو کسی کے ۔ کہ شاید اُس کا کچھ پیغام لادے ۔ کبھی بستی میں بیتابانہ پھرنا ۔ کبھی صحرا میں جوں دیوانہ پھرنا

۱؎ یعنی وہ ۔ یہ لفظ اس مثنوی میں ہر جگہ اسی طرح لکھا ہوا ہے

کبھی کرتا جو کوئی[1] یہ آ کے مذکور — کہ دیکھی آج ہیں وہ غیرتِ حور
تو اُٹھ کر اُس کے بس قربان جانا — اور آنکھیں اپنی آنکھوں سے لگانا

کبھی وہ سوزشِ دل کا جو مہجور — برنگِ شمع کچھ کرتا تھا مذکور
جھکا جاتا تھا تن اُس کی بیاں سے — نکلتا تھا دھواں نوکِ زباں سے

کبھی رونا تڑپنا تلملانا — کبھی پہروں نہ دست و پا ہلانا
کبھی حال اپنا اپنے ہی سے کہنا — کبھی جا کر اکیلے بیٹھ رہنا

جو جی واں روتے روتے ڈوب جاتا — تسلی کو بجز غش کون آتا
کبھی اُس سے جو کوئی کہتا کچھ آ کر — تو گر پڑتا وہ ہیں بس غش وہ کھا کر

کبھی دھرتا تھا منہ پر آستیں کو — کبھی گھبرا کے اُٹھ جاتا کہیں کو
کبھی منہ ڈھانپ کر ظاہر میں سوتا — کبھی وہ دربدر پھرتا تھا روتا

کبھی جو راہ چلتے چلتے یک بار — کسی کی دور سے سنتا تھا گفتار
لگا دیتا تھا کان اُدھر وہ مہجور — کہ شاید کچھ اُسی کا ہو نہ مذکور

کبھی کہتا کسی سے غم جتا کر — کہ تا اُس سے کہے وہ شخص جا کر
کبھی سنتا جو کچھ ذکرِ محبت — تو ہوتی تھی عجب کچھ اُس کی حالت

کہ پہلے تو وہ سر زانو پہ دھر کے — نہ روتا پر نہ روتا ضبط کر کے
پھر آخر آپ میں رہتا نہ جب ہائے — تو کیا حالت کوئی اُس دم کی بتلائے

بدن جوں بید مجنوں تھرتھراتا — کہ کوئی[1] سر تا قدم ایسا کپکپاتا
اگرچہ تھامتے لوگ اُس کو آ کر — نہ تھمتا پر نہ تھمتا تلملا کر

یہ دل سے آہ ایک آتی زباں پر — کہ لے جاتی اُڑا کر آسماں پر
ولے تھی بخت کی یہ نارسائی — زمیں پر پھر وہ گرتا جوں ہوائی

طبیعت میں جب اُس کے جوش آتا — تو وہ ہرگز نہ روکا اُس سے جاتا
زمیں پر یوں وہ گرتا جست کر کے — کہ رہ جاوے کوئی جس شکل مر کے

سب اُس کو دیکھ کر حیران رہتے — یہ چپکے چپکے سب آپس میں کہتے
کوئی کہتا ہوا کیا اُس کا عالم — کوئی کہتا کہ شاید چل بسا دم

کسی کی چشم سے خونناب ڈھلتا — کوئی بیٹھا کفِ افسوس ملتا
کوئی نبض اُس کی لے کر دیکھتا تھا — کوئی دھر ہاتھ دل پر دیکھتا تھا

کوئی کہتا کہ حیف اُس کی جوانی — کوئی لا کر چواتا منہ میں پانی
کوئی سر اُس کا لے زانو پہ دھرتا — کوئی تلووں کو بیٹھا گرم کرتا

کوئی دیکھ اُس کو ہوتا سخت حیراں — کوئی کرتا تھا چاک اپنا گریباں
کوئی کہتا تھا چپکے سے موا یہ — کوئی کہتا کہ ہے ہے کیا ہوا یہ

کوئی نادم ہو کہتا ہر زماں یہ — عبث چھیڑی تھی ہم نے داستاں یہ
دُعا یہ مانگتا تھا کوئی ہر آن — خداوندا بچا دے اِس کی تو جان

کسی صورت یہ کچھ اب منہ سے بولے — ذرا چونکے ٹک اپنی آنکھ کھولے
کوئی کہتا یہی رو رو کے ہیہات (ق) — گزرتی ہی مرے دل میں تو یہ بات

سُنیں گے جب کہ خویش و اقربا حال — تو پھر ہو دیگا ساری گھر کا کیا حال
غرض پھر آپ میں آتا نہ جب وہ (ق) — تو پھر ناچار واں سے لوگ گھر کو

اُٹھا لاتے تھے سب یوں اُس مکاں سے — کہ جیسے کوئی اُٹھ جاوے جہاں سے
کبھی کرتا تھا کچھ گفتارِ جاں سوز — کبھی پڑھتا تھا یہ اشعارِ جاں سوز

غمِ فرقت سے دل جل بل ہوا خاک — غرض اب زندگی اپنی ہے کیا خاک
ہوئے کیوں مبتلا بیٹھے بٹھائے — لگا یہ روگ کیا بیٹھے بٹھائے

---

[1] کوئی کا تلفظ یہاں کُئی کرنا چاہیے

نت اشک گرم ہیں اس چشم تر میں
بھڑکتی ہی ایک آتش سی جگر میں
کہاں تک ہجر میں مرتا رہوں میں
الٰہی کیا کروں کس سے کہوں میں

کوئی صورت نہیں ہے زندگی کی
رہی جاتی ہی جی میں بات جی کی
بھلا ہی ہجر میں جی سے گزرنا
غرض بہتر ہے اِس جینے سے مرنا

خوشی کیا خاک اُس بن گھر میں ہوں میں
یہ جی میں ہی کہ گھر کو پھونک دوں میں
نہ دیکھوں جب تلک وہ چشم میگوں
بہاوے خوں نہ کیوں کر چشم پُر خوں

وہ مژگاں جب کہ غائب ہوں نظر سے
نہ کیوں کر تیر سے گزریں جگر سے
سنوں جب تک نہ میں اُس لب کی گفتار
خموشی سے نہ ہو کیوں کر سروکار

نہ دیکھوں جب تلک وہ زلفِ پرخم
تو ہو کیوں کر نہ میرا حال برہم
لچک اُس تیغِ ابرو کی جو یاد آئے
تو کیوں کر دل جگر ٹکڑے نہ ہو جائے

میسر جب تلک اُس کا ہو نہ پابوس
ملوں کیوں کر نہ بیٹھا دستِ افسوس
وہ صحبت یاد کر جب دل کراہے
تو جی مل بیٹھنے کو کس سے چاہے

جو اُس اخلاص کی یاد آئیں باتیں
تو چلاتے کٹیں کیوں کر نہ راتیں
کبھو کرتا یہ ذکر اُس رشک مہ کے
کبھو پڑھتا غزل یہ آپ کہہ کے

غزل

تیری دوری نے محنت اور بخشی
غم آگے تھا اذیت اور بخشی
مزہ تھا زخمِ دل کے درد کا پر
نمک پاشی نے لذت اور بخشی

قریب آیا تھا وہ پر مرگ نے آہ
نہ ایک دم ہم کو فرصت اور بخشی
عسل میں ہی مزا پر نیشِ غم نے
میرے دل کو حلاوت اور بخشی

ترے مذکور نے میری زباں کو
فصاحت اور بلاغت اور بخشی
وفا عاشق سے جس معشوق نے کی
وفا نے اُس کی اُلفت اور بخشی

تعجب ہے تیرے جور و جفا نے
میرے دل کو محبت اور بخشی

کرم سے جب حسنؔ بوسہ دیا تب
کرم بخشی نے راحت اور بخشی

زبس صورت جو اُس کی روبرو تھی
تو اکثر ہجر میں یہ گفتگو تھی
نہ ان باتوں سی جب ہوتی تسلی
تو پھر پھر وصل ہی کو چاہتا جی

مثل یہ کہتے ہیں سب صاحب رائے
کہ ہرگز کھائی بن بھوکا نہ پتیائے
جو ان باتوں سے بہلاتا تھا دل کو
تو بیتاب اور بھی پاتا تھا دل کو

کہوں کیا کچھ عجب کٹتی تھی اوقات
بغل میں دل کو بیتابی تھی دن رات
قلق سی یک بیک پڑتا تھا دل جب
تو ہل جاتا تھا اُس کا تن بدن سب

دلِ بیتاب کا تو تھا یہ احوال
کہوں کیا دیدۂ پُرنم کا میں حال
برنگِ شمع ساری رات رونا
کسی صورت نہ سونا پر نہ سونا

بہاتی تھی جو آنسو چشم پُرنم
گھلا جاتا تھا تن اشکوں سے ہر دم
جو لوگ آتے تھے واں بہرِ عیادت
تو ہوتے تھے وہ حیراں دیکھ صورت

یہی کہتے تھے سب آپس میں رو رو
ہوا کیا حضرتِ خواجہ حسن کو
جو کوئی کرتا تھا جا اُن سی ملاقات
سوا اِس بات کے کرتے نہ تھے بات

ہوئی یوں یار اور ہم سے جدائی
خدائی ہی خدائی ہی خدائی
نہ جا سکتے ہیں نہ آتا ہے وہ یار
ہوئی ہے زندگانی سخت دشوار

نکل جاوے یہ جی اب کاش تن سے
جو چھوٹ جاویں ہم اس رنج و محن سے
نہ تھی اس کو کسی صورت سے کل آہ
زباں پر تھی یہی ہر دم غزل آہ

غزل

نہ آیا پر نہ آیا یار افسوس
چلی اب تن سے جانِ زار افسوس
نہیں کل ایک دم ایک آن ایک پل
ہوئی ہے زندگی دشوار افسوس

فلک نے داغ پر دے داغ مجھ کو
چھڑایا مجھ سے وہ گلزار افسوس
میرے اب سر پٹکنے کے سبب آہ
کریں ہیں یہ در و دیوار افسوس

سنوں میں کب تلک پہلو میں میرے
کراہے ہے دلِ بیمار افسوس
نہ دل لے کر خبر لی پھر ہماری
غرض افسوس اے دلدار افسوس

عزیزو سانس لے سکتا نہیں میں
ہوا کیا ہے مجھے آزار افسوس
دل و جان و جگر کو تو نے رو رو
بہایا دیدۂ خوں بار افسوس

دم الٹا لگ گیا ہے دست و پا سرد
بچوں گا کیوں کہ میں بیمار افسوس
کہیں ہیں سب اطبا دیکھ مجھ کو
یہ ہی مرنے کے ہیں آثار افسوس

میری کرتا تھا دل تیمار داری
ہوں اب میں دل کا ماتم دار افسوس

غرض یہ جب ہوئی عاشق کی حالت
ہوئی معشوق کو تاثیرِ الفت
سنو اب یاں سے ٹک احوال تم آہ
عزیزو ہے عجب قصہ یہ جاں کاہ

وہ غم اس نے کئی دن تو کیا ضبط
ولے آخر نہ اس سے ہو سکا ضبط
ہوا یوں یک بیک جاناں کا احوال
کہ ہو جوں مردۂ بے جاں کا احوال

گری جو بسترِ اندوہ پر آہ
یکایک ہو گئی یوں بے خبر آہ
بہت سب نے پکارا پر نہ بولی
کئی دن تک نہ اس نے آنکھ کھولی

سبھوں نے گھر میں واویلا مچایا
ولے اس نے نہ اپنا لب ہلایا
کئے جب اس طرح سے پانچ چھ روز
کہ تھی خاموش وہ شمع دل افروز

گماں اس پر لگے یہ لوگ کرنے
کیا یہ حال جادو کے اثر نے
نہ سمجھا درد اس کا کوئی بیدرد
کیا کرتے تھے بہتاں سب زن و مرد

عزیزو وہ پری تھی نیم جاں آہ
اور اس پر سب یہ کرتے تھے گماں آہ
کوئی کہتا تھا ہے یہ سخت عیار
کیا ہے مکر اس نے ہے یہ مکار

کوئی کہتا تھا دم سادھا ہے اس نے
عمل حضرت سے جو سیکھا ہے اس نے
کوئی کہتا تھا یوں جو رحم دل تھا
میادا ہو گیا ہو اس کو سکتا

کوئی کہتا تھا اب فصد اس کی کھلواؤ
تغافل مت کرو فصاد بلواؤ
کوئی کہتا تھا شاید جن لگا ہے
کہیں بے جا قدم جو پڑ گیا ہے

کوئی عامل جو ہو تو اس کو بلواؤ
فلیتہ دو دلے سے جھڑواؤ پھکواؤ
کوئی کہتا تھا اس کو جوشِ خوں ہے
کوئی کہتا تھا یہ مکر و فسوں ہے

غرض حق کو بھلا اس بے وفا نے
کہا تب یہ کہ اس کے مبتلا نے
مقرر اس پہ اب جادو کیا ہے
وگرنہ اس کو ایسا کیا ہوا ہے

کئی دن تو رہی یہ اس کی حالت
پھر آئی عشق سے بارے کچھ افاقت
صدا یوں آئی جب لب اس نے کھولے
کوئی جوں اندرونِ چاہ بولے

ہوئی طاقت بدن سے ایسی زائل
کہ تھا کروٹ بھی لینا اس کو مشکل
نپٹ ہوش و حواس اس کے ہوئے گم (ق)
اور اس سے جب صدا نا ترس مردم

لگے یوں پوچھنے وے گرد ڑکا
بتا ہم کو کہ ہے یہ ماجرا کیا

لگی آہستگی سے یوں سُنانے
ذرا تو ہوش آنے دو ٹھکانے

ضعیف ایسا ہی غم نے کر دکھایا
سخن کہتے ہی پھر غش اُس کو آیا

ہوا طاقت سے جسم اس رنگ خالی
کہ جوں بے حس ہو تصویرِ نہالی

ہوئے تھے مردمانِ خانہ حیراں
یہی کہتے تھے وہ آپس میں ہراں

بلائے جان ہے آزار کیا ہے
خدا جانے کہ یہ اسرار کیا ہے

عزیزو کیا کہوں میں وہ مصیبت
تھی اُس آفت رسیدہ کی یہ حالت

نہ سمجھا بات کوئی اُس کے جی کی
وہاں کہتے تھے سب اپنی ہی اپنی

کوئی کہتا تھا کچھ اس نے پیا ہے
اُسی کا نشہ یہ اس کو چڑھا ہے

کوئی کہتا تھا میں سمجھوں ہوں یہ بات
نہ لاؤ اور کچھ دل میں خیالات

کسی نے کچھ جو بات اس کو پڑھائی
تو اپنی اس نے یہ صورت بنائی

کوئی کہتا تھا مجھ کو یہ یقیں ہے
کئی دن سے جو کچھ کھایا نہیں ہے

تو مارے بھوک کے بیدم پڑی ہے
یہی تدبیر اب اس کی بڑی ہے

کسی صورت سے کچھ اس کو کھلاؤ
خیال اب اور کچھ دل میں نہ لاؤ

وے کب کھانے اور پینے کا تھا ہوش
نہ تھا اُس کو براز و بول کا ہوش

کوئی اس کی نہ تھا حالت سے آگاہ
بیاں کیا کیجئے قصہ مختصر آہ

لگی رہنے جب اس کی یونہیں حالت
کہ گاہے غش تھا اور گاہے افاقت

ہوئی تھی تلخ ایسی زندگانی
کہ وقتِ نزع ہو جوں سخت جانی

ہوا جو اُس کا یہ احوال بیہات
سبھوں نے دل میں ٹھہرائی یہی بات

نہ سمجھو کچھ مرض اس کو ہوا ہے
کسی ساحر نے کچھ جادو کیا ہے



کہیں عاشق کو جو پہونچی خبر یہ
کہ ایذا ہے اب اُس کی جان پر یہ

نہیں کچھ بات کے کرنے کی قدرت
کہاں بستر پہ ہے ہلنے کی طاقت

کوئی دم کی ہے مہماں جاں بلب ہے
سرہانے شمع ایک گریہ کناں ہے

پھر اُس کا دیکھ کر احوال اب آہ
گمانِ بد یہی کرتے ہیں سب آہ

کوئی کہتا ہے مکر اس نے کیا ہے
کوئی کہتا ہے سایہ ہو گیا ہے

کوئی کہتا ہے سب مجھ کو خبر ہے
یہ بے شک اس پہ جادو کا اثر ہے

یہ جس کا حال ہووے ہائے افسوس
کہیں مکر اُس کو سب ہے جائے افسوس

یہ قصہ جونہیں خواجہ کو سُنایا
تو دم گھبرا کے وہیں لب پہ آیا

یہ کہہ بھجوایا اُس کی نائکہ کو
بُھلا مت دل سے تو خوفِ خدا کو

نہ کر اس پر گمانِ مکر و فن تو
نہ کہہ یہ بھی کہ ہے تاثیرِ جادو

یہ کوہِ درد و غم ٹوٹا ہے اس پر
گمانِ مکر و فن بیجا ہے اس پر

سبھی مکروں سے بے تقصیر ہے یہ
کسی کے عشق کی تاثیر ہے یہ

کہ اب کچھ گر تدارک اس کا ہووے
مبادا جانِ شیریں کو یہ کھووے

دعا سے اور دوا سے ہو نہ غافل
وگرنہ تجھ کو ہو گی سخت مشکل

سمجھتی اب تو ہے تو اس کو مکار
خدا ناکردہ گر ایسا ہو آزار

کہ نکلے خونِ دل اس کے دہن سے
تو دے گی کیوں کے نسبت مکر و فن سے

تجھے گویا کوئی ایسا ہو آزار
کہ صحت ہووے اُس سے سخت دشوار

تو پھر مکار تو کس کو کہے گی
علاج اپنا کئے بن کب رہے گی

کہا جب جا کے یہ پیغام بر نے
لگی یک بارگی وہ دل میں ڈرنے

علاج اُس کا لگی کرنے یہ تدبیر
دوا اُس کو یہ کرتی تھی نہ تاثیر

عجب دُکھ میں تھی وہ ہر دم بچاری — کہ تھی دن رات اُس کو دم شماری
غرض تعویذ لاکھوں ہی لکھائے — اُسے ایک دم میں دو دو سو پلائے

کسی تعویذ کا پر کیا اثر ہو — نہ جاوے دل پہ جو نقشِ حجر ہو

کہوں کیا ماجرا میں یاں سے اُس کا — اثر ہوتا تھا تعویذوں کا اُلٹا
نظر آئی نہ صورت بہتری کی — ہوئی وحشت زیادہ اُس پری کی

ہوا پیدا جو دل میں جوشِ سودا — رہا اُس کو کسی کا کچھ نہ خطرا
لگی کہنے وہ یوں دیوانہ پن سے — ملادو کوئی بخشی کو حسن سے

نکل جاؤں گی گھر سے آج کل میں — موئی جاتی ہوں بن آئے اجل میں
کبھی کہتی تھی یوں ہر سو نظر کر — کہاں بیٹھی ہوں میں کس کا ہے یہ گھر

میں یاں کیوں آئی میرا کام کیا ہے — یہ گھر جس کا ہے اُس کا نام کیا ہے
کوئی کچھ پوچھتا تو کچھ نہ کہتی — مگر صورت کو اُس کی گھور رہتی

جو کہتی تو یہی کہتی وہ رو رو — کیا ہے کیوں عبث محبوس مجھ کو
تمام اُس بن ہوئی جاتی ہوں میں تو — ارے لوگو موئی جاتی ہوں میں تو

کبھی جا جا کے ناحق سب سے لڑتی — کبھی وہ آپ اپنے سے بگڑتی
کبھی رہتی تھی اُس کی سوئے در آنکھ — کبھی تھی رخنۂ دیوار پر آنکھ

کبھی رو رو کے کچھ وحشت سے بکتی — کبھی پھر روتے روتے ہنسنے لگتی
کبھی جھنجھلا کے اپنے ہمنشیں پر — کبھی وہ لوٹتی پھرتی زمیں پر

کبھی تو اپنے سر پر خاک اُڑاتی — کبھی ہونٹوں کو غصے سے چباتی
کبھی آنسو بہاتی چشمِ تر سے — کبھی کہتی وہ کچھ دیوار و در سے

کبھی اس شور سے کرتی تھی کلّا[۱] — اُٹھا لیتی تھی سر پر سب محلا
کبھی اپنا گریباں چاک کر کے — نکل جاتی تھی باہر اپنے گھر سے

کبھی اپنے کسی ہمراز سے وہ — بصد منت یہی کہتی تھی رو رو
جو اب بھی اُس کی کچھ آوے نشانی — تو پھر ہو جائے میری زندگانی

جو اب بھی اُس کا کوئی پیغام لاوے — تو مردہ بات کہنے میں جلاوے
جو اب بھی مجکو وہ دکھلائے صورت — تو میری زیست کی ہو جائے صورت

کبھی دو دو پہر چوکھٹ پکڑ کر — کھڑی رہتی تھی وہ حیران در پر
کبھی مایوس ہو یوں دل سے ہٹتی — کہ چھاتی دیکھنے والوں کی پھٹتی

کبھی بکتی تھی کچھ واہی وہ ناکام — کبھی جا بیٹھتی تھی بر لبِ بام
کھڑی رہتی کبھی رستے پہ جا کے — کبھی گلیوں میں پھرتی غل مچا کے

کبھی جپنا کسی کا دم بدم نام — کبھی دے بیٹھتی لوگوں کو دشنام
کبھی مونہہ نوچ کر سر پیٹ لیتی — کبھی روتی تڑپھتی جان دیتی

کسی صورت نہ صدمہ غم کا جاتا — گر آرامِ غش آتا تو آتا
کبھی جا بیٹھتی تھی گر کسی پاس — تو کہتی تھی یہی وہ کشتۂ یاس

غمِ دلبر سے دل پر میں غمیں ہے — اُمید اب مجکو جینے کی نہیں ہے
الم پر ہے الم اور غم پہ ہے غم — نظر آتی ہے مجکو موت ہر دم

سدا گھبرا کے دم آتا ہے لب تک — اُمیدِ وصل پر جیتی ہوں اب تک
جو تم سے ہو سکے کچھ میری تدبیر — کرو بہرِ خدا اس میں نہ تاخیر

ہوئی جس کے لئے میری یہ حالت — کسی صورت دکھا دو اُس کی صورت
اُسے لے آؤ یا لے جاؤ مجکو — بہر صورت اُسے دکھلاؤ مجکو

جدھر ہو اُس کی آمد رفت یکسر — بٹھا دو مجکو ٹک اُس رہگزر پر
نہیں تو سامنے اُس رہگزر کے — چلے آؤ کھڑا تم مجکو کر کے

[۱] شور غل

نہ جا نزدیک سے حالت کہوں گی — بھلا ٹک دور سے ہی دیکھ لوں گی — اگر شفقت یہ تم مجھ پر کروگے — تو مجھ مرتی ہوئی کو جان دوگے

جو مجھ سے جان مانگو گے تو دوں گی — میں ساری عمر لونڈی ہو رہوں گی — نہیں تو جی نہیں بچنے کا میرا — کہ غم نے بے طرح اب مجھ کو گھیرا

ہوئی ہے ناتوانی مجھ کو یاں تک — سخن آتا نہیں میری زباں تک — نظر آتی ہوں یوں میں پیرہن میں — کہ جیسے ہو کوئی مردہ کفن میں

نہیں تابِ سخن مجھ میں تو زنہار — خدا جانے کہ ہے یہ کس کی گفتار — سخن جب ناامیدی کا وہ سنتی — تو کیا کیا سوچ کر کے سر کو دھنتی

پھر اُٹھتی واں سے وہ یوں ہو کے مغموم — کسی مفلس سے جوں سائل ہو محروم — کبھی تو تھا خموشی سے سروکار — کبھی یہ درد کے پڑھتی تھی اشعار

یہ درد و غم سے حالِ دل ہوا ہے — کہ دم لینا مجھے مشکل ہوا ہے — مروں تو جائے یہ دردِ جدائی — الٰہی کیا اجل کو موت آئی

الٰہی کس سے اپنا دکھ کہوں میں — اب اس جینے سے جلدی مر رہوں میں — میری قسمت میں گریہ دکھ لکھا تھا — تو یا رب کیوں مجھے پیدا کیا تھا

نہیں آرام اب مجھ نوحہ گر کو — خداوندا نکل جاؤں کدھر کو — کسی صورت سے کل آتی نہیں ہے — الٰہی کیوں اجل آتی نہیں ہے

کوئی جز غم نہیں ہے غمگسار اب — فقط ہے بے قراری ہی قرار اب — الٰہی کیا علاج اپنا کروں میں — یہ جی میں ہے کہ بس کچھ کھا مروں میں

کبھی زانو پہ وہ لاتی تھی سر کو — کبھی پتھروں سے ٹکراتی تھی سر کو — کبھی روتی زمیں پر بیٹھ یاں تک — کہ موجِ اشک جاتی آسماں تک

کبھی جوں برق یوں بیتاب پھرتی — کہ گہ اُٹھتی زمیں سے گاہ گرتی — نقاہت سے جو اُٹھتی غم کے مارے — تو آنکھوں آگے چھٹ جاتے ستارے

کبھی جوں رعد یہ کرتی فغاں وو — کہ ہوتا زلزلہ سارے جہاں کو — کبھی خوں روتی اور سب کو رلاتی — غزل یہ حسبِ حال اپنے سناتی

غزل

بچے جی کیوں کہ اس دردِ محن سے — ملے جب تک نہ یہ بخشی حسن سے — مجھے جینے دو اُس کا نام یارو — رکھو مت باز اذکارِ حسن سے

جنونِ غم سے وحشت کو بھی اب آہ — ہوئی وحشت میرے دیوانہ پن سے — یہ وحشت اور یہ جاں کاوی مری سی — نہ مجنوں سے ہوئی نہ کوہ کن سے

کرے کیوں کر نہ مجکو بیکلی تنگ — نہ بولوں جب تک اُس غنچہ دہن سے — یہ دل بھڑکے ہے گلخن کی طرح آہ — کہ شعلے اُٹھتے ہیں میرے دہن سے

کروں گر بعدِ مردن آہِ جاں سوز — دھواں نکلے میرے گور و کفن سے — بس اب کرنے دے مجکو چاک ناصح — بہ تنگ آیا ہے جی اس پیرہن سے

مروں تو بھی کہوں عاشق ہوں اُس کی — زباں بدلوں نہ ہرگز اس سخن سے — پگھلا جاتا ہے تن جوں شمع میرا — لگی ہے آگ یہ دل کی لگن سے

رکھا جاتا نہیں اب جسم پر ہاتھ — کہ آتش سی نکلتی ہے بدن سے — ہم کیا عیش تھے بزمِ طرب میں (ق) — پر اُس کو لے گئی یوں انجمن سے

کہ جیسے آتے ہی فصلِ بہار آہ — کوئی گل توڑ لے جاوے چمن سے — جسے کہتے ہیں طاقت سو وہ یکبار — کنارا کر گئی مجھ خستہ تن سے

کہوں کس سے جدائی کے الم کو | کہ ہے غم سے میرے اندوہ غم کو | نظر کر کے یہ رنگ زرد میرا | ہوا ہے درد اب ہمدرد میرا

رہا ہے آہ کیا اب مجھ میں باقی | نہیں طاقت ذرا اب مجھ میں باقی | مجھے کہتے ہیں یوں اب دیکھ کر سب | نہ ایسا ہو کسی کا حال یارب

کبھی کہتی جو درد دل کسی سے | بہ تنگ آتا وہ اپنی زندگی سے | طبیعت یوں کبھی رونے پہ آتی | کہ آپ اشکوں سے اپنے ڈوب جاتی

کبھی جو داغ دل لگتی دکھانے | تو پھر خورشید لگتا تھرتھرانے | کبھی چپ اس طرح سے بیٹھ رہتی | کہ سنتی سب کی اور اپنی نہ کہتی

کبھی سوز جگر سے ہو کے نالاں | غزل یہ پڑھنے لگتی تھی بہ الحاں

غزل

یہ کیسی آگ اس غم نے لگائی | دہائی ہے دہائی ہے دہائی | پہونچ جلدی کہ مرگ و زیست میں ہاں | لڑائی ہے لڑائی ہے لڑائی

کہیں مرتا ہے عاشق اس کا پر موت | جدائی ہے جدائی ہے جدائی | میری اب عشق نے مجنوں کی سی شکل | بنائی ہے بنائی ہے بنائی

طرح رونے کی میرے ابر نے بھی | اڑائی ہے اڑائی ہے اڑائی | زبس میری سرشک چشم کا رنگ | حنائی ہے حنائی ہے حنائی

کہیں ہیں سب کہ آنکھ اس نے کسی سے | لگائی ہے لگائی ہے لگائی | میرا دل لے کے اس نے مجھ سے صورت | چھپائی ہے چھپائی ہے چھپائی

مروں گی بے اجل یہ بات میں نے | جتائی ہے جتائی ہے جتائی

عزیزو اس کا تو رہتا یہ احوال | سنو اب یاں سے ٹک خواجہ کا بھی حال | کر آب چشم سے اپنے وضو آہ | یہی کہتے تھے ہو کر قبلہ رو آہ

چلا اب تن سے جی فرقت کے غم سے | خداوندا ملا دے اس صنم سے | عجائب ایک دن کا ماجرا ہے | عزیزو عشق بھی کیا بد بلا ہے

جو خادم رہتے تھے خدمت میں دن رات | لگے کہنے ایک روز ان سے یہ بات | کہ ہم نے اس کو معشوقہ کیا ہے | تو پھر معشوقہ کا رتبہ بڑا ہے

جسے معشوق کہیے ہے وہ معبود | پرستش اس کی کرنے میں ہے بہبود | تو پھر معبود کا ایسا ہے رتبہ | کہ پانچوں وقت کیجے اس کو سجدہ

سو اب گھیرا ہے دل کو اس الم نے | کہ سمجھا ہے جسے معشوق ہم نے | رہے سجدے سے بھی ہم اس کے پابوس | پرستش ہی چھٹی افسوس افسوس

و لے یہ بات ہے اب دل میں آئی | کہ اس کے در پہ کیجے جبہ سائی | کوئی تدبیر بن آتی نہیں آہ | نہ اس کی تا کہ راضی ہو ہر گاہ

تو پھر کیوں کر ہو اس کے در پہ جانا | مگر کوئی خدا کر دے بہانا | اگر جاویں تو واں جانا ہے مشکل | نہیں جاتے تو رہ سکنا ہے مشکل

سراپا ہم کو اب حیرت ہے حیرت | کہ رہنے کی نہ ہے جانے کی قدرت | بیاں یہ گفتگو جو ہو رہی تھی | کہ آ کر یہ خبر ایک شخص نے دی

ہوا ہے مجکو یہ احوال معلوم | کہ ہے وہ مبتلائے غم جو مغموم | نہایت درد و غم ہے اس کے در پے | سبھوں نے بات ٹھہرائی یہی ہے

اسے دکھلایئے سیر و تماشا | کسی صورت سے تو بہلے دل اس کا | مقرر صبح نکلے گی وہ گھر سے | ابھی سنتا ہے آیا ہوں ادھر سے

نکلنا مہروش کا صبح گھر سے ۔ سنا عاشق نے جو پیغامبر سے
طلوعِ مہر کے بھی پیشتر آہ ۔ یہ جا بیٹھا تھا گھیر اُس کا سر راہ
خدا یاد آیا دیکھ اُس کی گلی آہ (ق) ہوئی ایسی ہی دل کو بیکلی آہ
کہ سارے تن بدن کو تھرتھری تھی ۔ نہ اُس سے مرتعش کو ہمسری تھی
نگہ پڑتی جو تھی اُس کی سوئے در ۔ زباں پر آہ تھی اور ہاتھ دل پر
نظر کرتے تھے جو پیر و جواں آہ ۔ سبھی کرتے تھے فریاد و فغاں آہ
وہاں خادم جو تھے ہمراہ دو چار ۔ سبھوں کو زندگی تھی سخت دشوار
کیا جس شخص نے اُس دم نظارا ۔ ہوا اُس کا گریباں پارہ پارا
کہ لوگ اُس غیرتِ خور کو سحر گاہ ۔ لئے آتے عجب صورت سے تھے آہ
بیاں کیا کیجئے اُس وقت کی بات ۔ عجب احوال تھا ہیہات ہیہات
لئے تھا ایک طرف کوئی ہاتھ اُس کا ۔ کرے تھی لغزشِ پا ساتھ اُس کا
کوئی آگے تھا کوئی اُس کے پیچھے ۔ اُسے یوں لوگ لے کر گھر سے نکلے
کہ جیسے مست جب ہو جائے سرشار ۔ اُٹھا لاتے ہیں میخانے سے ہشیار
سراپا اس قدر لرزہ تھا اُس کو ۔ تنِ خورشید کو جوں تھرتھری ہو
نظر یہ آیا جب خواجہ کو احوال ۔ کہوں کیا میں عجب اُس کا ہوا حال
ولیکن بیکلی کو ضبط کر کے ۔ کہا ایک شخص سے یوں آہ بھر کے
ذرا یہ بات تم کہہ دو جتا کر ۔ کھڑا ہی یہاں کوئی مجرے کو آکر
یہ جو ہیں بات اُس کے کان پہونچی ۔ تنِ بیجاں میں گویا جاں پہونچی
بظاہر گرچہ تھا آنکھیں چرانا ۔ وے باطن سے تھے تھا نظریں ملانا
گئے نزدیک حضرت ایک دم سے ۔ سلام اُس کو کیا جھک کر ادب سے
نظر ابرو کی جب محراب آئی ۔ تو سجدے کو وہیں گردن جھکائی
اُسے پھر سجدہ یوں کرنا ہوا فرض ۔ کرے ہی جس طرح کوئی ادا فرض
نیاز اس کا اور اُس کا ناز پنہاں ۔ خدائی کا تھا وہاں جلوہ نمایاں
عجائب عشق نے حالت دکھائی ۔ ہمیں اللہ کی قدرت دکھائی
بُرا اُس کو سمجھنا پر بُرا ہے ۔ عیاں اس بات سے سرِّ خدا ہے
سمجھتے ہیں اُسے ابلیس اے یار ۔ کرے آدمؑ کے سجدے سے جو انکار



گیا سجدہ وہ کر کر اپنے گھر پھر ۔ کیا پھر عشق نے ایسا اثر پھر
ہوئی افزود اُس کی بیقراری ۔ لگے کرنے دو چنداں آہ و زاری
یہ گھبرائے اُسے لے گئے چمن کو ۔ لگائی آگ اور اُس گلبدن کو
کسی کے دل میں ہو جب عشق کا خار ۔ اُسے سوجھے سو پھر کیا سیرِ گلزار
تماشا عشق نے ایسا دکھایا ۔ کہ لطفِ سیر سب دل سے بھلایا
عبث اُس کے تئیں وہ لوگ نادان ۔ دکھانے لے گئے تھے سیرِ بستان
کہ تھی سیرِ چمن کیا اُس کو درکار ۔ نظر آتا تھا اُس کو اور گلزار
پریشاں موئے سر تھے اُس کو سنبل ۔ سمجھتی تھی گریباں چاک جوں گل
جلا دیکھا جو دل پر داغ کالا ۔ کہا یہ میرے گلشن کا ہی لالا
یہ دل کو بیکلی تھی بے تامل ۔ قفس میں جوں کرے ہی شور بلبل
ہر ایک تھی آہ موزوں رشکِ شمشاد ۔ جسے سن کر کرے قمری بھی فریاد
کھلی وہ رہ گئی جب چشم جاناں ۔ تو جانا دیدۂ نرگس ہے حیراں
اور اڑانی تھی اُسے پھر خستہ جانی ۔ ہوا تھا رنگ اُس کا زعفرانی
لب آہ سرد سے کھلتے تھے یوں ہائے ۔ نسیم صبح سے جوں غنچہ کھل جائے

نہ گویائی رہی تھی کچھ زباں میں ‏ ‏ کہ جوں سوسن ہو خاموش گلستاں میں ‏ ‏ سرشکِ چشم تھے دامن میں جاری ‏ ‏ کہ ہو جوں آبِ جو گلشن میں جاری

رہا دم چشمِ تر میں اس طرح سے ‏ ‏ حبابِ آب جو ہو جس طرح سے ‏ ‏ نہ تھی ہلنے کی طاقت کچھ بدن میں ‏ ‏ کہ ہو جوں سرو کا سایہ چمن میں

سراپا جسم اُس کا داغ سے باغ ‏ ‏ جوانی میں لگا افسوس یہ داغ ‏ ‏ پھر ایسے کو دکھائی سیرِ بستاں ‏ ‏ جو سمجھے باغ کو گویا ہے زنداں

نہ اُس کا دل لگا اُس جا کوئی طور ‏ ‏ ہوئی سیرِ چمن سے بیکلی اور ‏ ‏ جسے ہووے گُلِ رخسار سے کام ‏ ‏ اُسے کیا گُل سے اور گلزار سے کام

وہاں جو لے گئے تھے لوگ اُس کو ‏ ‏ دکھانے سیر گلشن کی عزیز و ‏ ‏ ہوا گھر تک اُنھیں دشوار لانا ‏ ‏ گئے سب بھول گلشن کو دکھانا

سبھوں کو جب ہوئی یہ بات معلوم ‏ ‏ کہ ہے یاں اور بھی دل اس کا مغموم ‏ ‏ بصد خواری اُسے بس گھر میں لائے ‏ ‏ بہ ناچاری اُسے پھر گھر میں لائے

یہاں آتے ہی ایک گل اور پھولا ‏ ‏ کہ نکلا مونھ سے اُس کے خونِ دل کا ‏ ‏ جو پہونچا صدمۂ غم متصل آہ ‏ ‏ ہوا دریائے خوں پہلو میں دل آہ

عجب ایذا اُٹھائی اُس صنم نے (ق) کیا ایسا ہی بار درد و غم نے ‏ ‏ سلوک اُس کے دلِ بیمار کے ساتھ ‏ ‏ کہ خوں آنے لگا کھنکھار کے ساتھ

وہ لب اُس کے صدف جس سے خجل ہو ‏ ‏ دُرِ دنداں سے گوہر منفعل ہو ‏ ‏ نمایاں سُرخیِ خوں اُس پہ تھی آہ ‏ ‏ عجب کچھ رنگ تھا اللہ اللہ

ہوئی یہ عشق سے حیرت ہویدا ‏ ‏ لگے ہونے صدف سے لعل پیدا ‏ ‏ ہوا تھا درد سے دل اُس کا جس رنگ ‏ ‏ نہو یارب دلِ کافر بھی اس رنگ

لگی اس شکل رہنے جیسے وہ محزوں ‏ ‏ کہ آتا تھا سدا جائے خیو خوں ‏ ‏ ہوا ایک شور و غوغا اُس کے گھر میں ‏ ‏ کہ یہ کیا ہو گیا اس کے جگر میں

لہو جو تھوکتی ہے دم بدم آہ ‏ ‏ ہوا کیا ہے یہ اس کے دل کو غم آہ ‏ ‏ یہ اس پر آئی آفت آہ کس رنگ ‏ ‏ یکایک ہو گیا جو حال اس رنگ

ہوا کثرت سے جب خونناب جاری ‏ ‏ قریبِ مرگ پہونچی یہ بچاری ‏ ‏ ہوا یہ رنگ اُس چہرے کا اے وائے ‏ ‏ خزاں میں رنگِ گل جس رنگ اڑ جائے

جگر غربال اُس کا بن گیا تھا ‏ ‏ زبس تیرِ بلا سے چھن گیا تھا ‏ ‏ وہ عارض اُس کے تابان و دل افروز ‏ ‏ خجل تھے مہر و مہ جس سے شب و روز

ہوئی غم سے یہ اُس مکھڑے کی صورت ‏ ‏ نگہ کرتے ہوئے آتی تھی دہشت ‏ ‏ عزیزو جب ہوا یہ حال اُس کا ‏ ‏ کہا ماں نے دیکھ احوال اُس کا

قطعہ

کفِ افسوس کو مل کر سرہانے ‏ ‏ دیا یہ کیا مرض اس کو خدا نے ‏ ‏ سبھی دیکھ اپنے بیگانے تب اُس کو ‏ ‏ یہی کہتے تھے گھر میں اُس کے رو رو

کوئی دم کی ہے اب مہمان بخشی ‏ ‏ خداوندا کر اس کی جان بخشی ‏ ‏ جوانی پر ٹک اس کی رحم کیجو ‏ ‏ دوبارا زندگی پھر اس کو دیجو

نظر آئی جب اُس کی زیست دشوار ‏ ‏ تو بولے مردمانِ خانہ یک بار ‏ ‏ ہوئی ہے مرگ کے یہ عنقریب اب ‏ ‏ کوئی گر متصل ہوئے طبیب اب

تو جلدی سے اُسے تم گھر میں بلواؤ ‏ ‏ اِسی کو یا کسی صورت سے لے جاؤ ‏ ‏ نہایت متصل تھے میر صادق ‏ ‏ طبیب ایسا نہیں ہے کوئی حاذق

کہ ہے اب وہ جہاں میں فخرِ لقماں ‏ ‏ شفا بخشِ علیلان و سقیماں ‏ ‏ زبس نسخہ میں تھا اعجازِ عیسیٰ ‏ ‏ ارسطو بھی کرے نسخہ نویسی

سبھوں نے مشورہ کر کے یکایک | اُسی کو لے گئے اُن کے مطب تک | جو دیکھا میر صاحب نے یہ احوال | لگے فرمانے یہ کیا ہو گیا حال

نہ تھی یہ موردِ آفات افسوس | دریغا حسرتا ہیہات افسوس | نہایت میر صاحب اہلِ دل تھے | اُنہوں کے اشک جاری متصل تھے

جو دیکھی نبض پھر اُس خستہ جاں کی | یہ حالت میر صاحب نے بیاں کی | قیامت سست ہے یہ نبض اللہ | بدرجہ صلب ہے اور ہے بطی آہ

ورم شُشش میں ہے اور ہے شدتِ تپ | مرض سل کا ہوا اس کے تئیں اب | ذبول اس کے بدن پر اب ہے پیدا | خشونت جلد پر بھی ہے ہویدا

بظاہر یہ سل و دق کے ہیں آثار | وے باطن میں ہے کچھ اور آزار | کسی کے چشم کی بیمار ہے یہ | مقرر اب اسے آزار ہے یہ

نہ تھے گو مطلع اس حال سے وہ | لگے سمجھانے اُس کی نائکہ کو | کوئی جو اس کے غم سے ہے دل افگار | اُسی کا سامنا ہے اس کو درکار

جو اندک شربتِ دیدار پاوے | شفا ایک دم میں یہ بیمار پاوے | وے ہے بہرِ تشفی ہی یہ بہتر | کہ دو دم قرصِ سرطاں اس کو جا کر

سُنی جب میر صاحب سے یہ تقریر | ہوئی وہ کچھ سمجھ کر سخت دلگیر | چلی پھر لے کے اُس بیمارِ غم کو | کہ جس کا عزم تھا ملکِ عدم کو

بدشواری اُسے پھر گھر میں لائی | دوا جو کچھ کہی تھی سو پلائی

عزیزو اس کو بہوتیری دوا کی | نظر آئی نہ پر صورت شفا کی | نپٹ تھی دن بدن حالت تبہ کچھ | دوا کرتی نہ تھی اُس کو اثر کچھ

فسادِ خوں کی خاطر فصد بھی کی | تھمی جوشش نہ وہ جو خون کی تھی | بہ ایں نوبت جو پہونچا اُس کا احوال | کسی نے یوں کہا تب دیکھ احوال

خدا پہ چھوڑ دوا اور غم نہ تم کھاؤ | کسی درگاہ میں تم اس کو لیجاؤ | یہ ہے ایک متصل درگاہ گھر کے | چلو سب مل قدم آنکھوں سے کر کے

وہ ہے ایک صاحبِ باطن کا مرقد | ہجومِ خلق واں ہوتا ہے بے حد | زبس ہے سودمند اُس سے جو سب خلق | کہے ہے جاگتی جوت اُس کو اب خلق

وہ ہی تاریکیِ عالم کو بس ہے | کہ جوں مہر اُس کے روضہ کا کلس ہے | جو نزدِ روضہ اُس کے گلستاں ہے | وہ گلشن غیرتِ باغِ جناں ہے

اُسے واں لے گئے بہرِ زیارت | کیا مجرا طلب کی واں سے حاجت | وے کس طور ہو حاجت روائی | کہ ہے مطلوبؔ طالب کی دوائی

بجز دیدار جو عاشق ہو رنجور | خدا سے بھی مرض اُس کا نہ ہو دور | وہ اُس درگاہ میں کرتی تھی مجرا | کسی نے یہ خبر خواجہ کو دی جا

تو اُن کے مشورہ یہ دل میں ٹھہرا | ذرا دیکھیں تو ہے واں ماجرا کیا | غرض تھی جس جگہ وہ رونق افزا | ہوئے یہ بھی وہاں تشریف فرما

ملیں نظروں سے واں نظریں جو فی الحال | ہوا دونوں کے دل کا کچھ عجب حال | اُدھر کرتی تھی وہ فریاد و زاری | اِدھر کرنے لگے یہ بے قراری

نہ دل جب رہ سکا تب آگے بڑھ آئے | قدمبوسی کو اُس کے ہاتھ دوڑائے | قدمبوسی سے پھر کر کر فراغت | مؤدب سامنے بیٹھے تھے حضرت

وہاں گزری عجب صحبت کوئی دم | کہ تھی کچھ گفتگو باطن میں باہم | یہی دونوں کے دل میں آرزو تھی | حجابِ تن اُٹھے جی سے ملے جی

نہیں پر چرخِ کجرفتار کا کام | کہ دیوے ٹک دلِ عاشق کو آرام | میسر ہو جو گاہے وصل کی رات | تو پھر وہ شب نہ ٹھہرے بات کی بات

یکایک آہ اُس غم خستہ جگر کو　　وہاں سے لے چلے پھر لوگ گھر کو

چلی پھر فاتحہ پڑھ اپنے وہ گھر　　عجب حالت ہوئی دونوں کے دل پر

اِدھر کو یہ چلی نالان و گریاں　　اُدھر کرنے لگے وہ شور و افغاں

سنو اب یاں سے محبوبہ کا احوال　　ہوا یہ حال گھر جانے سے فی الحال

حس و حرکت رہی تن میں نہ افسوس　　ہوئے سب زندگی سے اُس کی مایوس

خموش اس رنگ تھی حیران و دلگیر　　بنے بستر پہ جوں بیمار تصویر

پھر اُس کے دل میں کچھ ایسا اٹھا درد　　کہ چہرہ گہ سفید اور گاہ تھا زرد

نپٹ احوال اُس کا زار تھا آہ　　کہ دم لینا اُسے دشوار تھا آہ

عجب آئی بلائے ناگہانی　　نہ تھی ہرگز اُمیدِ زندگانی

یہی کہتے تھے باہم گشتہ یاس　　نہیں اب اس کے جینے کی ہمیں آس

کوئی تو یاد کرتا تھا خدا کو　　کوئی دیکھے تھا اُس کے دستِ پا کو

کوئی دیکھے تھا رو رو آسماں کو　　کوئی کہتا تھا بد اس مکاں کو

ہوئی تھی زندگی ان کی بھی بھاری　　جو اُس کی کرتے تھے بیمارداری

ہوئی پھر نائکہ جو غم سے حیران　　ہوا ناگاہ اس شدت سے خفقان

کبھی گھر میں تھا گہ بیرونِ در گام　　کسی صورت نہ تھا اک جا نہ آرام

ہوا ناگاہ یہ آزار اُس کو　　کہ صحت جس سے تھی دشوار اُس کو



کہوں اب یاں سے کیا احوالِ جانسوز　　عجائب ماجرا ہے گزرا ایک روز

کہیں حضرت کے دل میں آئی یہ بات　　کہیں چلیے ذرا بہرِ ملاقات

چلے پھر خانِ عالی شان کے پاس　　کہ یعنی خان عالم خان کے پاس

تو ناگہ آئے جاناں کی گلی میں　　پڑی تھی واں وہ اپنی ڈیوڑھی میں

عجب احوال معشوقہ کا تھا آہ　　کہ سب کرتے تھے واں فریاد جانکاہ

نظر گریہ کناں آیا جو ہر ایک　　تو دم گھبرائے اُن کا آیا لب تک

دلِ بیتاب پہ پھر ہاتھ دھر کے　　قدم وہاں سے اٹھائے ضبط کر کے

اِدھر دل اُس طرف کو کھینچتا تھا　　اُدھر عزم اُن کا تھا ایک اور جا کا

اٹھا کر سخت ایذا و صعوبت　　گئے جو پاس خاں صاحب کے حضرت

عجائب ماجرا واں دیکھا جا کر　　کہ اُس کی نائکہ بیٹھی تھی ششدر

یہی کہتی تھی وہ رو رو کے ہر بار　　عجب دکھ میں ہوئی ہوں میں گرفتار

مجھے ہے زندگی ایک آن دوبھر　　بنا ہے کلبۂ احزاں میرا گھر

نظر کرتی ہوں گھر میں جس پہ ایک بار　　اُسے میں دیکھتی ہوں شکلِ بیمار

خصوصاً جس کی خاطر سب یہ گھر ہے　　عجب ایذا اب اُس کی جان پر ہے

کوئی ساعت کوئی دم کی ہے مہمان　　رہا جاتا ہے دل کا دل میں ارمان

یہی آتا تھا اب مجکو پہ لکھا　　کہ دنیا کا ابھی کیا اس نے دیکھا

نہایت بے کلی سے تلملا کے　　یہی کہتی تھی خاں صاحب کے آگے

یہ میری عرض ہے سن اس کو لیجے　　سفارش اب مری حضرت سے کیجے

کہ لازم اس پہ ہے اب مہربانی　　نہیں ہے اب خیالِ بدگمانی

معاف اب کیجئے عاجز کی تقصیر　　تمہیں سے ہو گی اس مردے کی تدبیر

وگرنہ زندگی ہے اس کو دشوار　　توجہ اس پہ ہے اس وقت درکار

تو پھر سن کر یہ خاں صاحب نے حالت　　کہا خواجہ کی خدمت میں بہ منت

کرم احوال پر بخشی کے کیجے　　گنہ جو ہو کسی کا بخش دیجے

سنی تقریر خاں صاحب کی جب یہ　　جواب اُن کو دیا خواجہ نے تب یہ

گنہ اُس کا نہیں ہوں میں گنہگار
کہ میرا ہوگیا ہی دل گرفتار

جو آفت آئی سو اُس کی سبب سے
جتایا تھا یہ میں نے اس کو کب سے

جو ہووے یک بیک ترکِ ملاقات
تو یہ دونوں کے حق میں کچھ نہیں بات

اِدھر فرقت میرا جی مفت لے گی
اُدھر وہ بے قراری سے مرے گی

بس اب جلدی نہ کر مہلت مجھے دے
کنارا تا کروں آہستگی سے

ولے یہ مانتی تھی کوئی میری بات
کہا اس نے ابھی چھوڑو ملاقات

سو اس میرے قلق کی ہی یہ تاثیر
بھلا اب ہو سکے کیا اس کی تدبیر

سنو صاحب مسیحا میں نہیں ہوں
کہ جا ایک دم میں مردے کو جلا دوں

یقین اس بات کا پر مجکو ہی خوب
کہ طالب کی دوا ہی وصلِ مطلوب

اگر یونہیں ہی مرضی اب تمہاری
تو وہ جو کر رہی ہی بے قراری

لگا ہی تیرِ غم اُس کے جگر میں
بلا بھیجو اُسے تم اپنے گھر میں

اگرچہ درد اُس کا لا دوا ہی
ولے آوے جو یاں تک تو شفا ہی

سُنی جب بات یہ اُس بے وفا نے
لگی خواجہ سے یہ اس دم جتانے

نہیں اُس میں تو اب ہلنے کی طاقت
کہاں ہی یاں تلک آنے کی قدرت

بھلا گر لائیں یاں اُس کو کسی طور
تو کیا ہو جائیگی چنگی وہ فی الفور

کہا خواجہ نے میں کیا جانوں یہ بات
ولے دیکھا ہی یہ ہی اکثر اوقات

خدا کے فضل سے گاہے وہ ہو جائے
کہ انسان کی نہ ہرگز وہم میں آئے

یہ سن کر نائکہ نے بات فی الفور
بلا بھیجا اُسے گھر سے کسی طور

عزیزو کیا کہوں میں اُس کا آنا
نہیں منظور اب مجکو رلانا

سخن کب آئے یہ میری زباں تک
وہ آئی جس خرابی سے یہاں تک

مفصل یہ بیاں کریئے اگر ہائے
تو چھاتی سامعوں کی اب پھٹی جائے

غرض لائے تھے واں اُس کو تو جس طور
اُٹھائے جاتے ہیں مردے کو جس طور

اُسے جو بزم تک لے آئے مردم
حواس و ہوش اُس کے سب ہوئے گم

پکارا اُس کے تئیں لوگوں نے ہرچند
ولے کھلتی نہ تھیں آنکھیں جو تھیں بند

سُنی حضرت کی جو آواز یک بار
ہوئی پھر چشمِ جاناں باز یک بار

جو دیکھی شکل عاشق اُس نے ایک آن
وہیں آئی تنِ بے جان میں جان

گئی یک بار دل سے رنج و کلفت
نظر آئی وہ ہیں آرام و راحت

لگا اُس کے سخن مونھ سے نکلنے
لگی اُٹھ کر وہیں وہ پھرنے چلنے

شفا ایسی ہوئی یک بار اُس کو
کہ گویا کچھ نہ تھا آزار اُس کو

دلِ غمگیں ہوا سینے میں مسرور
عزیزو سچ ہی یہ دنیا میں مشہور

مرض جس شخص کے تئیں عشق کا ہو
بغیر از وصل اُس کی کیا دوا ہو

خدا نے سو کیا اُس کو میسر
بھلا پھر اُس کو صحت ہو نہ کیونکر

ہوا پھر نائکہ کو یہ جو معلوم
کہ اس میں شاد ہوتی ہی یہ مغموم

وہ جب سنتی تھی واں خواجہ کا آنا
تو پھر جلدی سے محبوبہ کو لانا

عزیزو سنیو ایک دن کا بیاں یہ
کہ اب تھوڑی رہی ہی داستاں یہ

ہوئی تھی گرچہ محبوبہ کو صحت
ولے باقی رہی تھی یہ اذیت

دہن سے خونِ دل نکلے تھا ہر بار
افاقت غش سے تھی پر تھا یہ آزار

کہ ایک دن نائکہ نے اُس کی یہ بات
کہی خواجہ سے آ وقتِ ملاقات

تمہارا سر بسر ہم پر کرم ہے
ولیکن دل میں اب اتنا یہ غم ہی

بہ کثرت جو لہو یہ تھوکتی ہی
تو اس کا غم ہی میرے جی کے درپی

کرم کیجئے کہ یہ موقوف ہو جائے شفاے کامل اب بیمار پائے
یہ خاں صاحب کے گھر میں گفتگو تھی اُسی گھر میں تھی وہ رشک پری بھی

وہ بولے گر یہ مرضی ہی تو اچھا ہمارے ہاتھ میں دہا تھ اس کا
خدا کے فضل سے ہی اب یہ اُمید کہ خنگی ہو سحر یہ رشکِ خورشید

مراقب پھر ہوئے سے ہاتھ میں ہاتھ نہ تھا جز ذاتِ حق اس دم کوئی ساتھ
کٹی جب اس طرح سے رات کامل ہوئی اُس کو شفا تا صبح حاصل

ولے یہ بات خواجہ نے جتائی اذیت قلب نے گر اس کے پائی
تو پھر ہو جائیگا یہ اس کو آزار غم و غصہ سے ہی پرہیز درکار

ولیکن احتیاط اُس نے نہ کی کچھ کبھی کچھ بات کہتی تھی کبھی کچھ
لس اور پہ زور گانے کا دلایا غم و غصہ بھی بے موجب کھلایا

ہوا پھر اُس بچاری کا یہی حال کہ جیسے پیش ازیں گزرا تھا احوال
ولے خونابہ دل پھر ہوا بند توجہ سے ہوئی حضرت کے خرسند

یونہیں یہ ماجرا گزرا کئی بار کہ اُس کو جب یہ ہو جاتا تھا آزار
تو لے آتے تھے سب نزدیک حضرت خدا کے فضل سے ہوتی تھی صحت

شفا آخر ہوئی پھر اُس کو ایسی کہ تھی وہ حالتِ صحت میں جیسی
یہ ظاہر قدرتِ حق سے ہوا جب ہوئے افزود اُن کے معتقد سب

بمنت نائکہ گھر اپنے لائی عجب تاثیر الفت نے دکھائی
لگے پھر گھر میں آنے جانے حضرت ہوئی افزود پھر آپس میں صحبت

پھر آمد رفت ٹھہری واں بدستور کیا اللہ نے دونوں کو مسرور
ہوئے وہ منفعل جو تھے منافق ملے آپس میں پھر معشوق و عاشق

خدا نے پھیرے اُن کے جس طرح دن پھریں سارے جہاں کے اس طرح دن

یہ ہم نے کیا کہا اور کیا لکھا ہی محبت کا ابھی قصہ بڑا ہی
میاں جرأت بس اب خاموش رہیے اور اس کو خاتمہ با لخیر کہیے

مجھے مدت ہوئی یہ جستجو تھی یہی خواہش تھی اور یہ آرزو تھی
کہ ایک قصہ سنا دے کوئی منظوم تو اُس کو کیجئے ہندی میں منظوم

ولے قصہ وہ دردِ عشق کا ہو کہ جو کوئی سُنے دیوے وہیں رو
سو کانوں بھی سُنا آنکھوں بھی دیکھا رہا ہرگز نہ کچھ خطرہ پر یکھا

کیا میں من و عن سب اُس کو تحریر نہیں جھوٹی سر مو میری تقریر
یہی ہی فرق افسانوں میں اس میں دروغ و راستی دیکھو ہی کس میں

سُنی کہتے ہیں سب دیکھی کہی ہیں انھوں نے جھوٹھ اور سچی کہی ہیں
یہی تاریخ اب اس کی عیاں ہی کہ حسن اور عشق کی ایک داستاں ہی

---

۵ اور کی جگہ د ہونا چاہیے ورنہ تاریخ صحیح نہیں نکلے گی ۔

اصطلاحات حیوانات و حیاتیات

حیو = حیوانات — حیا = حیاتیات

(از جناب مولوی محمد وحیدالدین سلیم پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ، دکن)

(سلسلہ کے لیئے ملاحظہ ہو رسالہ حصہ ہشتم جلد دوم بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ع)

Boa	بوا (حیو)
Boidae	بوٗایلہ (حیو)
Bombycidae	کرمزایلہ (حیو)
Bombycid	کرمزایلی (حیو)
Bombyciform	کرمزیہکو (حیو)
Bombycina	کرمزیلہ (حیو)
Bombycin	کرمزی (حیو)
Bombyliidae	غنّایلہ (حیو)
Bombyx	کرمز (حیو)
Botaurus	بگلا (حیو)
Botaurinae	بگلایہ (حیو)
Bothriocephalus	چسرا (حیو)
Bothrium	چسنی (حیو)
Bovidae	ثورایلہ (حیو)
Brachal	بازوئی (حیو)
Brachiferous	بازودار (حیو)
Brachiolaria	بازوچہ (حیو)
Brachiolarian	بازوچکی (حیو)
Brachiopod	بالہایہ (حیو)
Brachiopoda	بالہایے (حیو)
Brachycera	کوتہ قرنہ (حیو)
Brachydont	کوتہ دنداں (حیو)
Brachydontism	کوتہ دندانی (حیو)
Brachyura	کوتہ دُمہ (حیو)
Brachypodous	کوتہ پا (حیو)
Braconidae	براکوتایلہ(حیو)
Braconid	برا کوتایلی(حیو)
Decacera	دہ شاخہ (حیو) دہ شاخے
Decacerate	دہ شاخی (حیو)
Decacerous	دہ شاخی (حیو)
Decapod	دہ پایہ (حیو)
Decapoda	دہ پایے (حیو)
Decapodan	دہ پائی (حیو)
Dermatozoon	جِلدیوان (حیو)
Dermestes	جلدخورہ(حیو) جلدخورے
Dermestidae	جِلدخورایلہ (حیو)
Dermestid	جِلدخورایلی (حیو)
Dermestoid	جِلدخور ایلی (حیو)

English	Urdu
Derotremata	چلد رزہ (حیو) چلدرزے
Derotremate	چلد رزی (حیو)
Derotrematous	چلد رزی (حیو)
Electrobiology	برقی حیانیات (حیا)
Electrobiological	برقی حیاتی (حیا)
Electrobiologist	برقی حیاتدان (حیا)
Electrobioscopy	برقی حیات بینی (حیا)
Falanaka	فالا ناکا (حیو)
Falconidae	بازایلہ (حیو)
Falconformes	باز پیکر (حیو)
Family	عایلہ (حیو)
Fibrospongiae	لیفسفنجیلہ (حیو)
Gastraea	شکمہ (حیا)
Gastricmill	معداس-شکماس (حیو)
Gastropod	شکم پایہ (حیو)
Gastropoda	شکم پایے (حیو)
Gastrotricha	شکم مویہ (حیو)
Gastrozooid	شکم حیمان (حیو)
Geometridae	ارضپیمایلہ (حیو)
Geometrine	ارضپیمایلی (حیو)
Geophila	زمین گیرہ (حیو) زمین گیرے
Geoplana	
Germ	چرمہ چرمے-چرمات (حیا)
Germinallayer	چرمی تہ (حیا)
Germinate	چرمیلا (حیا)
Germinate	چرمانا (حیا)
Germination	چرماؤ (حیا)
Germuucleus	چرمی نوات (حیا) چرمیوات
Germplasm	چرمانچہ (حیا)
Germtheory	چرمی نظریہ (حیا)
Germcell	چرمخن (حیا
Germinal	چرمی (حیا)
Germule	چرمولہ-چرمیزہ (حیا)
Glaucidium	بومچہ (حیو)
Globefish	گیند مچھلی (حیو)
Globicephala	گوسرہ (حیو) گوسرے
Globiferous	کُریلا (حیو)
Globigerina	کرویہ (حیو) کرویے
Globigerinidae	کروایلہ (حیو)
Globigerine	کروایلی (حیو)
Globule	کریوہ (حیا)
Globuliferous	کریوہ دار (حیو)
Globuloid	کریواسا (حیا)
Gloea	سریش (حیا)
Glossate	زباندار (حیو)
Glossiphonia	زبانلی (حیو)

Glosshyal (حیو) زبانالامي
Halobates (حیو) یمرؤ
Hepatopancreas (حیو) جگر لبلبه
Hydrozoa (حیو) مائیوان (حیو) مائیوانات
Hydrozoan (حیو) مائیواني
Hygrophilous (حیا) نماشنا
Hygroplasma (حیا) نمانچه-نمقالب
Hylophagous (حیو) چوب خوره
Hylotomous (حیو) کت کات
Hyganoidei (حیو) لامی دمکیلیاں
Hyomandibular (حیو) لامازیرفکي
Hyostylic (حیو) لامامتوني
Hypopharyngeal زیر بلعومي - زیر حلقي (حیو)
Hypopharynx (حیو) زیر بلعوم
Hystricidae خار پشایله حیو))
Hystricoid (حیو) خار پشایلی
Hystricinae (حیو) خار پشیله
Hystricomorpha (حیو) خار پشمان
Hystricomorphic (حیو) خارپشماني
Hystrix (حیو) خارپشت
Lagopus (حیو) خرگوشپا
Lamarckian (حیا) لامارکي
Lamarckism (حیا) لامارکیت

Lamellibranchiata (حیو) صفیریه صفیرے-صفیریات
Lamellibranchiate (حیو) صفیري
Lamellicorn (حیو) تختیشاخ
Lamellicornia (حیو) تختیشاخه تختیشاخے
Lamelliferous (حیو) تختیلا-تختیدار
Lamelliform (حیو) تختیسا-تختي نما
Lamellirostral (حیو) صفیتول
Lamellirostres (حیو) صفیتوله صفیتولے
Laminiplantar (حیو) تختیپا
Laminiplantation (حیو) تختیپائي
Lempyridae (حیو تابودایله
Lampyrine (حیو) تابودایلي
Lancet fish (حیو) نشتر ماهي
Langur (حیو) لنگور
Laniidae (حیو) قصابایله
Lenius (حیو) قصاب
Lapidicolous (حیو) حجرشین
Longicorn (حیو) لم سنگا
Longicornia (حیو) لم سنگے
Mandibulata زیر فکه (حیو) زیر فکے
Mandibulate (حیو) زیر فکي
Mycetozoa فطریوان (حیو) فطریوانات

Myeetozoan فطریوانی (خور)

Myocomma عضلی ضمہ (حیو)

Myomere عضپارہ (حیو)

Myomorpha موشمان (حیو)

Myomorphic موشمانی (حیو)

Myriapod لک پایہ (حیو)

Myriapoda لک پایے (حیو)

Myriapodan لک پاوی (حیو)

Myriapodous لک پاوی (حیو)

Myocyte عضلخلیہ (حیو)

Myodome عضلبیت (حیو)

Neoromere پچھ پارہ—عصب پارہ (حیو)

Neoroceole عصب جوف (حیو)

Neoroceolian عصب جوفی (حیو)

Neoroptera پچھ بالہ (حیو) پچھ بالے

Neoropteran پچھ بالی (حیو)

Neoropterous پچھ بالی (حیو)

Neoropodium پچھ پایہ (حیو)

Neoropodial پچھ پاوی (حیو)

Neoroskeleton عصبانی کالبد—عصبانی پنجر (حیو)

Octactinal اٹھ کرنا (حیو)

Octodont اٹھ دنتا (حیو)

Octodontidae اٹھ دنتایلہ

Octodonit اٹھ دنتیا

Octopoda (حیو) اٹھ پیرا—ہشپایہ اٹھ پیرے—ہشپایے

Octopodan (حیو) ہشپاوی—اٹھ پیری

Odontaspididae (حیو) دندان پرایلہ

Odontocete دندویل (حیو)

Odontostomatous (حیو) دند موہنا

Oedemeridae (حیو) سُنجنکایلہ

Oedemerid (حیو) سُجنکا—سنجنکایلی

Oenocyte میخلیہ (حیو)

Oligochaeta چند مویہ (حیو) چند مویے

Oligodontous (حیو) چندندان

Ommastrephes دید گرداں (حیو)

Ommastrephidae (حیو) دیدگردایلہ

Organ عضو (حیا)

Organic عضوی (حیا)

Organic selection (حیا) عضوی انتخاب

Organism عضویہ (حیا)

Organizable (حیا) عضویت پذیر

Organizability (حیا) عضویت پذیری

Organogenesis (حیا) عضو آشکاری

Organography اعضا نامہ (حیا)

Organographical (حیا) اعضا نامگی

Organographist اعضا نگار (حیا)

Organonomy	عضو آئینی (حیا)
Organotrophic	عضو پرور (حیا)
Ovariole	مبیضک (حیو)
Saccate	کیسلا (حیا)
Sabella	سابلّا (حیو)
Sabellaria	سابلیہ (حیو)
Sabellarian	سابلی (حیو)
Sabellidae	سابلایلہ (حیو)
Sabellid	سابلایلی (حیو)
Saccopharynx	کیسگلو (حیو)
Saccopharyngidae	کسگلایلہ (حیو)
Sagitta	بان (حیو)
Salmo	سالمو (حیو)
Salmon	سالمون (حیو)
Salmonidae	سالمونایلہ (حیو)
Salmonid	سالمونایلی (حیو)
Salmonoid	سالموناسا (حیو)
Salpa	سالپا (حیو)
Saltatoria	جہندہ (حیو) جہندے
Saltatoria	جہندگی (حیو) جہندی
Saltigradae	جست کار (حیو) جست کارے
Sapphirewing	سافر بال (حیو)
Saprophagous	گندخوارہ (حیو)
Saprophyte	گندرخت (حیا)
Saprophytic	گندرختی (حیا)
Saprophytism	گندرختیت (حیا)
Sarcode	لحمان (حیا)
Sarcodic	لحمانی (حیا)
Sarcodina	لحمانہ (حیو)
Sarcodyctium	لحمی شبکہ (حیو)
Sarcophaga	لحم خوارہ (حیو)
Sarcophagidae	لحم خوارایلہ (حیو)

تبصرے

جواہرات حالی۔ روح نظیر۔ اردوئے معلّیٰ۔ مطبوعات جامعہ ملّیہ اسلامیہ علی گڑھ (احسن القصص۔ مبادیِ معاشیات۔ تاریخ الامت حصّہ اوّل) سفرنامہ اسیر مالٹا۔ داغ جگر۔ شاعری کی تیسری کتاب۔ تجارت کی دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب۔ مثنوی سلطانہ رضیہ بیگم۔ اُردو کے نئے رسالے۔ فرمان نبوت۔ قاضی بدرالدولہ مرحوم و مولوی محمد باقر آگاہ۔ تذکرہ میر حسن دہلوی۔

جواہراتِ حالی

اِس مجموعہ میں مولانا حالی مرحوم کا وہ کلام ہے جو کبھی ایک مرتبہ کسی اخبار یا رسالہ میں چھپا اور پھر شائع نہیں ہوا اور اب کہیں دستیاب نہیں ہوتا یا وہ نظمیں ہیں جو اب تک کبھی شائع نہیں ہوئیں اور مولانا کے مسوّدوں یا اُن کے بعض احباب سے ملی ہیں۔ بڑی چھوٹی کل نظمیں ملاکر ۴۹ ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کی یہ تجویز تھی کہ مولانا کے کلام کا ایک عمدہ نسخہ کئی جلدوں میں طبع کیا جائے اور اِس کے لئے اُن کا وہ کلام جمع کیا جا رہا تھا جو اب تک الگ شائع نہیں ہوا۔ ہم شیخ محمد اسمٰعیل صاحب سکرٹری اورینٹل پبلک لائبریری پانی پت کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے ہماری محنت کو ہلکا کر دیا اور جہاں تک ممکن ہوا انہوں نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام اِس مجموعہ میں ایک جگہ جمع کر دیا۔ شیخ صاحب کا یہ کام بہت قابلِ قدر اور لایق شکریہ ہے۔ شروع میں لایق مرتب نے مولانا کی شاعری اور ان کی تصانیف پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔

مولانا حالی کے کلام کے متعلق کچھ کہنے سُننے کی چنداں ضرورت نہیں وہ جلسے ابھی ابھی درہم برہم ہوئے ہیں جہاں اُن کے پُردرد اشعار نے بھری مجلسوں کو تڑپا تڑپا دیا تھا اور اچھے اچھے ضابط اپنے دلوں پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ مولانا نے اُردو ادب اور شاعری ہی میں انقلاب نہیں پیدا کیا بلکہ لوگوں کے خیالات اور دل و دماغ میں بھی ہل چل پیدا کر دی تھی، اُن کا نقطۂ نظر بدل دیا تھا اور اُن کے غور و فکر کے لئے ایک نئی راہ پیدا کر دی تھی۔ اُن کے کلام کی حلاوت زبان کی فصاحت اور بیان کی قوت ایسی تھی کہ بڑے بڑے منکر بھی آخر کو مان گئے اور سینکڑوں اُس رستے پر پڑ لئے

بڑے بڑے ثقات جنھوں نے ایک کے سوا دوسرا سبق نہیں پڑھا تھا، وہ کہنہ مشق شعرا جنھوں نے اپنے کوچہ سے کبھی قدم باہر نہ رکھا تھا، اس اثر سے نہ بچ سکے، گو خود انھیں نہ معلوم ہوا ہو کہ یہ اثر کہاں سے پہونچا اور یہ تغیر کیوں کر پیدا ہوا۔ آج جو ہم اُردو ادب اور خاص کر شاعری میں خیالات کی جدت، بیان کی صفائی اور زور دیکھتے ہیں وہ سب مولانا کا طفیل ہے۔ چوں کہ اُن کے کلام میں درد اور خداداد تاثیر تھی اس لیے بے حد مقبول ہو گیا اور اس عام مقبولیت نے ادب و شاعری میں بہت جلد انقلاب پیدا کر دیا۔ مولانا کا کلام اُردو میں کلاسک یعنی ادبیات عالیہ کا درجہ رکھتا ہے وہ ایک ایسی تاریخی چیز ہو گئی ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔

اِس مجموعہ میں زیادہ تر مولانا کے دورِ آخر کا کلام ہے جو حکیمانہ رنگ رکھتا ہے، لیکن زبان کا سچا ذوق اور بیان کا خاص انداز اِن میں بھی ویسا ہی پایا جاتا ہے جیسا پہلی نظموں میں بلکہ پختگی اور الفاظ کے خاص خاص استعمال میں ترقی نظر آتی ہے۔ اِس مجموعہ کے دیکھنے سے اکثر لوگوں کو یہ بات نئی معلوم ہو گی کہ مولانا نے چھوٹے بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھی تھیں یہ زیادہ تر مسٹر نولٹن پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی فرمایش پر لکھی گئیں۔ یہ نظمیں بہت صاف سیدھی سادی ہیں۔ لیکن اصل شے جو دوسری جگہ ڈھونڈھے سے نہیں ملتی وہ درد ہے جو اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اُردو شاعری میں یا تو یہ میرؔ کے حصے میں آیا ہے یا حالیؔ کے حصے میں۔ مولانا جب قوموں کے عروج و زوال اور مصیبت زدوں کی بپتا بیان کرنے پر آجاتے ہیں تو دُنیا کا کوئی شاعر اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی مجموعہ میں ایک نظم ہے جو انھوں نے بمبئی کی کانفرنس میں پڑھی تھی۔ اِس کے ایک بند میں یہ بیان کیا ہے کہ خود تنزل ہی ترقی کا سرچشمہ ہے۔ ایک کا تنزل دوسرے کا عروج ہے ؎

کوئی یہاں بنتا نہیں جب تک نہ بگڑے دوسرا — گھاس کھد جاتی ہے جب پڑتی ہے تب کھیتی میں جان

ہوتے ہوتے خشک جب دریا میں خاک اُڑنے لگی — تب ہوئے نہروں سے جنگل غیرتِ باغِ جناں

چہچہے مرغِ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب — کر چکا کیڑے مکوڑے جب ہزاروں نوشِ جاں

جان تو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب — جب تنزل یا رو بگڑتا کوئی گھر یا خانداں

آسماں سے بن کے خواں آتا نہیں اقبال کا — ہے وہی اک چیز، کل یہاں یہاں تھی آج واں

قصر و ایواں ہوں مُبارک تم کو اے محنت کشو · عیش کے بندے بہت ہونے کو ہیں بے خانماں
یاد رکھو! ہوں گے اب حقدار، اُن کے جانشین · ہاتھ سے حق کھو دیئے اپنے جنھوں نے رائیگاں

اے مسلمانو! فلک کی گردشوں سے غافلو! · تم کو رخصت ہی، لٹا وقت و دولت رائیگاں
دیکھو جب غیروں کو تم بڑھتا کرو اپنے پہ ناز · ہیں تمہارے عیش و غفلت کی یہ سب فیاضیاں
مت کرو شکوہ مشیّت کا خدا ظالم نہیں · بلکہ ظالم ہیں تمہاری اپنی بداعمالیاں
یہ ہے قانونِ الٰہی جو کبھی ٹلتا نہیں · گو جگہ سے اپنی ٹل جائیں زمین و آسماں

انجمن مویدالاسلام دہلی کے لئے "امداد یتیمان" پر ایک بہت پُردرد اور بے مثل قطعہ لکھا ہی۔ اسلام اہل اُمت سے خطاب کر کے کہتا ہی کہ تم دعوے اسلام تو کرتے ہو مگر دردِ اُمت نہیں رکھتے اور جب تک یہ درد نہ ہوگا یہ سب ننگ ہی۔ نہ تمہاری نمازیں قبول ہوں گی نہ حج اور نہ روزے ؎

اعضا تو نمازوں میں بہت تم نے دُکھائے · دل کو بھی کبھی ہاتھ سے کچھ دے کے دُکھاؤ
دُنیا میں جراحت یہی عقبیٰ میں ہے راحت · کل پھل کو جو کھانا ہے تو زخم آج اُٹھاؤ
یہ قوم کے بچے جو پڑے پھرتے ہیں بیکس · یہ پَود ہے میری، اسے دیکھو نہ گنواؤ
شیریں ہی پھل ان پودوں کا اور سایہ ہی گھن کا · سیوا کرو اِن کی، انھیں پروان چڑھاؤ
دیکھو نہ حقارت سے پھٹے کپڑوں کو اِن کے · اِن گدڑوں میں جو لعل کہ گم ہیں انھیں پاؤ
سنولائے ہوئے چہروں میں نور اُن کے ہی تاباں · اِن کوئلوں کو ہیرے، جلا دے کے بناؤ
ہیں اِن میں فقیہہ، اِن میں حکیم، ان میں مُحدّث · ان کی بُری حالت پہ، بُری گت پہ نہ جاؤ
جوان میں ہیں جوہر، کہیں زنگ اُن کو نہ کھا جائے · گُن دیکھنے ہیں اُن کے تو زنگ اُن کا چھڑاؤ
افواج مخالف ہیں تگ و دو میں چپ و راس · رُند جائیں نہ یہ خاک میں جلد اُن کو اُٹھاؤ
پھرتے ہیں بہت گھات میں یہاں آ کے شکاری · اِن پنچھیوں کو موت کے چنگل سے بچاؤ

آگے چل کر چند شعر ایسے دردناک کہے ہیں کہ پڑھ کر دل لرز جاتا ہے۔

بکیس نہ گنواں ان کو یہ کنبا ہی خدا کا* — تم پھیر کے منہ ان سے، خدا کو نہ رُٹھاؤ
عبرت کی جگہ ہی، ڈرو گردش سے فلک کی — اولاد کو اپنی نظرِ بد سے بچاؤ
بن باپ کا بنتے ہوئے لگتی نہیں کچھ دیر — غیرت کو بس اللہ کی حرکت میں نہ لاؤ

ٹوٹے ہوئے دل ہیں یہ گزرگاہ خدا کی — ملنا ہے خدا سے تو اسی راہ سے جاؤ

ایک دو رُباعیاں بھی ہم ناظرین کے لئے نقل کرتے ہیں۔

رباعی

پیری نہیں، منزلِ فنا ہے گویا — اب کوچ کا وقت آلگا ہے گویا
یوں جسم سے ہوگئی حرارت کافور — اِک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

دولت کی ہوس، اصل گدائی ہی یہ — ساماں کی حرص، بے نوائی ہی یہ
حاجت کم ہی، تو ہے یہ شاہنشاہی — اور کچھ نہیں حاجت، تو خدائی ہی یہ

اہل ہند کے متعلق لکھتے ہیں۔

نکبت میں ہی رنج و غم، خوشی سے اولیٰ — رونا یاروں کا ہے ہنسی سے اولیٰ
ہیں وہیں میں بے وقار، پردیس میں خوار — مرنا ہے بس ایسی زندگی سے اولیٰ

کہاں تک کہئے، ان کے کلام میں حقیقت کے ساتھ کچھ ایسا سوز و گداز ہی کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک غزل کے چند شعر لکھکر اس تبصرے کو ختم کرتے ہیں ؎

نہ عیش کیخسروی رہیگا نہ صولتِ بہمنی رہے گی — رہیگی اے منعمو! تو باقی دیئے کی کچھ روشنی رہی گی
رہیگی گردش دکھا کے نیچا جو ہوگئے تارے تم آسماں کے — سدا کسی کی بنی رہی ہے نہ اب کسی کی بنی رہیگی
رہیگی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن — خدا نگہباں ہی قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہیگی
صفائیاں ہورہی ہیں جتنی، دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے — اندھیرا چھا جائیگا جہاں میں اگر یہی روشنی رہیگی

بگاڑنے مذہب نے جو ہیں ڈلے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے　　یہ جنگ وہ ہی جو صلح میں بھی یونہیں ٹھنی کی ٹھنی رہیگی

جو لوگ مولانا حالی کے کلام کے قدرداں ہیں وہ اِس مجموعہ کی قدر کریں گے اور ہم شیخ محمد اسمٰعیل صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ جواہر پارے گمنامی سے بچا لئے[1]۔

رُوحِ نظیر

یہ نظیر اکبر آبادی کے کلام کا انتخاب ہی۔ جو سید محمد محمود رضوی بی اے مخمور اکبر آبادی نے کیا ہی اور شروع میں ایک دیباچہ ۱۳ صفحہ کا، ایک مقدمہ ۴۲ صفحہ کا اور ایک تبصرہ ۷۸ صفحہ کا لکھا ہی۔ تبصرہ میں جا بجا نظیر کے کلام سے مثالیں دی ہیں۔ یہ نظیر کی شاعری پر بہت اچھّا تبصرہ ہی۔ آخر میں ۱۶۳ صفحہ پر کلام کا انتخاب ہی۔ اِس کے بعد منتخب کلام کی ایک فرہنگ بھی ہی۔ کلام کا انتخاب بہت اچھّا کیا ہے اس سے مخمور صاحب کے ذوق صحیح کا پتہ لگتا ہی۔

نظیر کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔ اُردو شعرا کے تذکروں میں کہیں ان کا نام نہیں آیا اور اگر کسی نے ذکر بھی کیا ہی تو بہت سرسری اور وہ بھی حقارت سے۔ ان کا کلام عامیانہ اور سوقیانہ سمجھا گیا ہے اور اِس لئے ناقابلِ التفات۔ اِس سے میاں نظیر کے کلام پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ ہمیں ملک کے اہلِ ادب کے ذوق اور رُجحان طبیعت کا پتہ چلتا ہی۔ یہ سب شخصی حکومت کے آثار ہیں۔ علم و ادب میں بھی وہی شان قایم رکھی گئی ہی۔ گویا عام لوگ کوئی چیز ہی نہیں اُن کے احساسات و جذبات اِس قابل ہی نہیں کہ توجّہ کی جائے اور اُن کی زبان اس لایق ہی کہ شرفا اور ثقات اپنی قلم و زبان اس سے آلودہ کریں اور اِسی لئے نظیر کو ان حضرات نے نہ کبھی شاعر سمجھا، نہ اس کا کلام پڑھنے کی زحمت فرمائی۔ مگر "عوام" نے بلاشبہ اس کی قدر کی اور اُن میں وہ بہت مقبول ہوا۔ لیکن اب زمانہ نے پلٹا کھایا ہے اور یقین ہی کہ نظیر کے کلام کی سچّی قدر کی جائے گی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو نظیر ہی سچّا ہندوستانی شاعر ہی۔ اُس کی زبان اس کے تشبیہات و استعارات اُس کے خیالات اور مضامین ٹھیٹھ ہندی ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔

اِس سیہ ابر میں یوں اُڑتے ہیں بگلے جیسے　　لبِ مالیدہ مِسّی میں درِ دنداں کی ضیا

---

[1] جواہرات حالی۔ مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب سکرٹری اور ینٹل پبلک لائبریری پانی پت

ملنے کا پتہ: شیخ محمد اسمٰعیل صاحب منیجر حالی بک ڈپو۔ پانی پت۔ قیمت مجلد (عہ) غیر مجلد (۸ھ) تعداد صفحات ۱۲۵

جگنو اِس طرح چمکتے ہیں کہ جوں وقتِ سنگار — ماتھے پر ماتی کے شنگرف ہے گویا چھڑکا

مور کا شور، فغاں غوک کی جھینگر کی جھنکار — پی پی ہر آن پپیہئے کی ہے ۔ کویل کی صدا

نظیر فطرۃً شاعر تھا اور اُس کا کلام مختلف لحاظ سے قابل قدر ہی۔ اِس زمانہ میں سب سے پہلے مولوی عبد الغفور شہباز مرحوم نے اِس طرف توجہ کی اور نظیر کا کلام جگہ جگہ سے بڑی کاوش اور محنت کے ساتھ جمع کیا اور اُس کی مبسوط سوانح عمری لکھی۔ مگر افسوس ہی کہ اس پر بھی نظیر کی جیسی قدر ہونی چاہیئے نہیں ہوئی۔ اگرچہ یہ کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہی مگر اصل واقعہ یہ ہی کہ سب سے اوّل نظیر کے کلام کی قدر بعض اُردو دان انگریزادیوں نے کی اور انھوں ہی نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا۔

مخمور صاحب کا یہ کام قابل قدر ہے اور ہمیں اُمید ہی کہ اہلِ ملک اِس انتخاب کو شوق سے پڑھیں گے۔ لکھائی چھپائی دونوں اچھی ہیں۔

اُردوئے معلّیٰ

یہ مرزا غالب کے اُن تمام واقعات کا مجموعہ ہی جو اب تک مختلف صورتوں میں طبع ہوئے ہیں۔ بلکہ ان میں کچھ اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً دو نئے رقعے نواب سید سجاد مرزا صاحب کے نام کے اور آخر کتاب میں چند رقعے سید غلام حسنین قدر بلگرامی مرحوم کے نام کے بطور ضمیمہ کے درج کئے گئے ہیں۔ جو اب تک کبھی نہیں چھپے تھے۔ کتاب کے شروع میں مرزا صاحب کے حالات اور عادات وخصائل پر ایک دیباچہ ہی جو ادیب سے نقل کیا گیا ہی۔ یہ نہیں معلوم ہوا کن صاحب کا لکھا ہوا ہی۔ آخر میں قدر بلگرامی مرحوم کے نام کے رقعے جو بطور ضمیمہ اضافہ کئے گئے ہیں اُن کے شروع میں چند صفحوں کا دیباچہ شیر محمد صاحب سرخوش نے تحریر فرمایا ہی۔ اس دیباچہ میں مرزا صاحب کے مکتوبات اور اُن کے طرز تحریر سے بحث کی ہی۔ پہلے حصّے کے ختم پر ڈاکٹر اقبال کی وہ نظم ہے جو انھوں نے مرزا غالب پر لکھی تھی۔ غرض یہ بہمہ وجوہ بہت مکمل نسخہ ہی اور بہت اچھا چھپا ہی۔

مرزا غالب کے رقعے اُردو زبان کا زیور ہیں۔ اُردو زبان جب تک زندہ ہی بہ شوق پڑھے جائیں گے

---

[۱] رام پرشاد اینڈ برادرس کتب فروش چوک آگرہ۔ قیمت (عہ/)

اور اِن کی دلچسپی کبھی کم نہ ہوگی۱؎۔

جامعۂ ملّیہ اسلامیہ علی گڑھ کی مطبوعات

(۱) احسن القصص نمبر ۱

ہماری زبان میں ایسی کتابوں کی بہت کمی ہے جسے لڑکے لڑکیاں بے تکلف پڑھ سکیں اور اُن کے مطالعہ سے اخلاقی اور دماغی فائدہ حاصل کر سکیں۔ جامعۂ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی یہ کوشش قابل قدر ہے کہ وہاں اس قسم کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ پہلا نمبر ہے اور اس میں نامور اسلاف کے ایسے تاریخی قصّے بیان کئے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر ہم اُن کے کارناموں کی قدر کر سکتے ہیں اور خودغیرت، حمیت، مہمان نوازی، عالی ظرفی اور ایثار کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اخلاق کی تعلیم نہایت دشوار کام ہے۔ یہ کتابوں اور امتحانوں سے حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ قانون اور قواعد انسان کو صاحب اخلاق بنا سکتے ہیں۔ اچھے اخلاق صرف اچھی صحبت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اگر یہ نصیب نہ ہو تو اچھے لوگوں کے حالات اور کارنامے ایک حد تک اِس منشا کو پُورا کر سکتے ہیں۔ اِس لئے اچھی سوانح عمریاں اخلاقی کتابوں سے زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ احسن القصص کا سلسلہ بہت مفید ثابت ہوگا اور مقبول بھی ہوگا۔ پہلی کتاب جو زیر تبصرہ ہے، مولوی محمدؐ بدرالدین سیوہاروی بی۔ اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل ہائی کورٹ الہ آباد و پروفیسر و ناظر المعارف جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تالیف ہے۔ اس میں ۸۴ تاریخی قصّے درج ہیں جو دلچسپ ہونے کے علاوہ اخلاقی لحاظ سے بھی مفید ہیں۔ اس میں زیادہ تر علما، شعرا عادل سلاطین اور خلفا کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور قصّے ہیں اور تقریباً سب کے سب ایسے ہیں جن کے پڑھنے سے طالب علموں اور عام پڑھنے والوں کے دلوں پر ضرور کچھ نہ کچھ اچھا اثر ہوگا۔ زبان بھی صاف اور سلیس ہے اور بیان سادہ اور بےتکلّف ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ دوبارہ جب یہ کتاب طبع ہو تو نظرثانی کے وقت زبان کی اصلاح کا خیال رکھا جائے اس کی بہت کم ضرورت ہوگی اور صرف دو تین مقامات پر خفیف سی تبدیلی کرنی پڑے گی۲؎۔

۱؎ شیخ مبارک علی پبلشر و تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور صفحات ۲۰۴ بڑی تقطیع قیمت (۱۲؍) ۲؎ جامعہ ملیہ اسلامیہ یا کیبز اینڈ کو تاجران کتب اُردو علی گڑھ محلہ رسل گنج سے مل سکتی ہے۔ تقطیع بڑی صفحات ۱۰۴ قیمت (۶؍)

(۲) مبادیِ معاشیات

(حجم ۱۴۰ صفحہ قیمت (عہ)

یہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر کینن کی انگریزی کتاب "اِلی منٹری پولٹیکل اکونومی" کا اُردو ترجمہ جامعۂ ملیہ علی گڑھ کی طرف سے بہت اچھے کاغذ پر صاف اور خوشخط چھپا ہے اور اِسی درسگاہ کے لایق اُستاد اور زبان اُردو کے ہونہار ادیب ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے کی دماغ سوزی کا قابلِ قدر نتیجہ ہے۔

کتاب کے تین حصّے ہیں۔ پہلے میں خوش حالی کے عام اسباب و لوازم کا بیان ہے۔ دوسری میں انفرادی دولت وملکیت کا حال ہے اور آخری حصّے میں ملک یا حکومت کی اجتماعی آسودگی سے بحث کی ہے۔ اصل کتاب کے مُصنف نے پیچیدہ مباحث اور علمی اصطلاحات سے تاامکان احتراز کیا ہے تاکہ معمولی لیاقت کے لوگ بھی کتاب سے فائدہ اُٹھا سکیں اور فاضل مترجم نے ترجمہ بھی بہت احتیاط اور قابلیت سے کیا ہے کہ اُردو میں کتاب کی یہ خصوصیت قایم رہے لیکن مصنّف کو اصل کتاب کے عام فہم بنانے میں کامیابی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، ہمارے خیال میں اُردو ترجمے کی ساری عبارت ایسی نہیں ہے کہ معمولی اُردو داں بلا دقّت اس کے مطالب کو سمجھ لیں۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس مبحث پر اُردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں سے اکثر کے مقابلہ میں یہ کتاب زیادہ عام فہم اور سلیس ہے اور سچ پوچھئے تو یہ ایسی خرابی ہے جس سے کسی علمی کتاب کے اردو ترجمے کا بالکل پاک ہونا نہایت دشوار ہے چنانچہ بعض اہل الرّائے سرے سے ترجمے ہی کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ جب ایسے ذہین مترجم نہیں ملتے جو غیر زبانوں کی علمی کتابوں کا اُردو میں صاف اور بے تکلّف ترجمہ کرسکیں تو اس سے بہتر ہے کہ ہم ہر مضمون پر خود اِس قسم کی اُردو کتابیں تالیف کرائیں جس میں اُردو داں طبقے کی لیاقت اور اپنی ضروریات کے مطابق علمی مطالب کو سلیس اور بامحاورہ زبان میں بیان کردیا جائے۔

"مُبادیِ معاشیات" میں علمی اصطلاحات بہت کم آئی ہیں کہ اِن پر کوئی بحث کی جائے۔ مگر ذاکر حسین صاحب نے بھی "اقتصادیات" کی بجائے "معاشیات" استعمال کیا ہے اور "تحفظِ تجارت" کے عام فہم و مُروجّہ لفظ کی جگہ بھی "تاین" کو ترجیح دی ہے۔ "اکنامکس" کے معنی میں لفظ "علم المعاش" کے استعمال کی نظیریں بھی قدیم عربی ادب میں بلا دقّت

مل جائیں گی لیکن کچھ مدت سے زبان اردو نیز دیگر اسلامی ممالک میں اقتصادیات کی اصطلاح رائج ہوگئی ہے اور
اس کے مقابلے میں "معاشیات" ابھی کسی قدر اجنبی لفظ معلوم ہوتا ہے مگر اس کے جامع ہونے میں شک نہیں اس
ضمن میں ہم چاہتے ہیں کہ اہل علم اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ اگر "اکنامکس" کے واسطے قدیم او رجامع لفظ "تدبیر منزل"
کا استعمال کریں تو کیا وہ معاشیات و اقتصادیات دونوں سے زیادہ پُرمعنی اور بہتر نہ ہوگا؟

(۳) تاریخ الامت (حصہ اوّل سیرۃ الرسول)

مولوی حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کی تالیف ہے۔ آغاز تمہید میں لایق مصنّف نے قدیم تاریخوں کی
طرف اشارہ کرکے اپنی مشکلات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔

"اسلام اور خاص کر اوائل اسلام کے حالات میں ہمارے قدما کی اس قدر مفصّل اور مبسوط تصنیفیں موجود ہیں
کہ ان سے اُس زمانہ کی تاریخ کا مرتب کرلینا آسان ہے لیکن جو دشواری ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے صرف
واقعات کو سلسلہ وار جمع کردیا ہے۔ نہ اُن کے اسباب سے تعرض کیا ہے نہ اُن کی نسبت رائیں لکھی ہیں"۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے اور اس لئے قابل مؤلف نے بیشتر اپنی کتاب کا ماخذ علامہ شیخ محمد الخضری اُستاد تاریخ اسلام
جامعۂ مصریہ و وکیل مدرسۂ قضاء شرعیہ کو قرار دیا ہے۔

ہم کو مصنف کے اس خیال سے بالکل اتفاق ہے کہ آج کل کے سوانح نگاروں کا یہ عام شیوہ ہے کہ جب کسی کی
سوانح لکھنے کو بیٹھتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ کسی معصوم بشر یا فرشتہ کے حالات لکھ رہے ہیں"۔ اسی طرح سلف
میں سے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ مشاجرات صحابہ کو نظر انداز کردینا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ عقیدت مندی کے لحاظ سے
اُن کا یہ قول درست ہو لیکن ہمارا مقصود محض فضائل و مناقب کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعات اور حقایق کا بیان کرنا
ہے تاکہ اُن سے عبرت حاصل کی جائے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے انھیں باہمی نزاعوں سے اُمّت کو بہت کچھ سبق ملتے ہیں
پھر ہم اُن کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہاں بحیثیت تاریخ کے ہمارا یہ فرض ضرور ہے کہ جو کچھ لکھیں بے تعصبی سے لکھیں تاکہ
ہماری سعی اُمّت کے لئے مفید اور اللہ کے نزدیک مقبول ہو۔

تاریخ الامت جن بہترین اغراض کو مدنظر رکھکر لکھی گئی وہ نہایت مبارک ہیں اور ہم مُصنّف کو مبارکباد دیتے ہیں کہ

انھوں نے ان تمام مشکلات پر غالب آکر جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں عام ناظرین کے لئے عموماً اور طلبہ کے درس کے لئے خصوصاً تاریخ اسلام کی بہت اچھی مختصر کتاب تیار کر دی ہے اس میں حتی الامکان تاریخی ضروریات کو نہایت خوبی سے پورا کیا گیا ہے اور غیر متعلق باتوں سے خواہ مخواہ کتاب کا حجم بڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جیسا کہ بعض مصنفین کی عادت ہے۔ ابتدا ءِ کتاب میں ملکِ عرب کا جغرافیہ، عرب کا نسبی سلسلہ ان کی مدنیت و بدویت، وہاں کی تجارت اور صنعت و حرفت، پھر عرب جاہلیت کا نظام سیاسی اس کا قومی اخلاق، دین و مذہب وغیرہ کا ذکر مختصراً مگر جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے حالات و واقعات قبل بعثت اور بعد بعثت کے لکھنے میں مصنف نے نہایت دیانت اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ عوام الناس کے عقاید اور جذبات کی خاطر مداہنت سے کام لے کر اپنے قلب سلیم کا خون نہیں کیا اور یہ تاریخ نگاری کا سب سے بڑا جوہر ہے۔

رسولِ خدا کے جزئی و کلی حالات و واقعات آپ کا اپنے اعزا اور اقارب اغیار و اجانب سے حسنِ سلوک اور طرز عمل اور ان کے متعلق عام ہدایات آپ کی اقتصادی اور سیاسی زندگی، آپ کے عام حسن اخلاق و معاشرت کا ذکر مصنف نے اس خوش اسلوبی اور حسنِ توجیہات کے سات کیا ہے جس کے ذریعہ سے مخالفین کی نکتہ چینیوں کا جواب اور ان کے حملوں کی روک تھام بخوبی ہو سکتی ہے۔

یہ کتاب اعادہ و تکرار مضامین اور اختلاف بیانی کے عیب سے مبرا ہے جس طرح سیرۃ نبوی میں ہم کو یاد پڑتا ہے کہ ایک جگہ تو مولانا شبلی نے ام المومنین حضرت صفیہ کی دوشیزگی ثابت کی ہے دوسرے مقام پر قبل شرف زوجیت دو شخصوں سے ان کا نکاح ہونا بیان فرمادیا ہے جیسا کہ جمہور مورخین کا خیال ہے۔

مصنف نے قرآنی سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کے سلسلہ میں شریعت مکیہ اور شریعت مدنیہ کی بہت اچھی تقسیم کی ہے اور بتایا ہے کہ مکی شریعت میں انھیں اصول دین کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جو تمام انبیاء میں مشترک سمجھے گئے ہیں یا جس کو ملت ابراہیمی اور دین حنیفی کہتے ہیں اور شریعت مدنی میں وہ خاص خاص احکام نازل ہوئے ہیں جن کی وجہ سے شریعت محمدی دوسرے شریعتوں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔

ہماری رائے میں یہ کتاب خصوصیت سے طلبا کے درس تاریخ اسلام کے لئے بیحد مفید اور کارآمد ہے۔ لکھائی

چھپائی بہت اچھی ہی۔

سفرنامۂ اسیر مالٹا

یہ حضرت شیخ الہند مولانا مولوی محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے اُن دردناک سوانح کا مرقع ہی جو حضرت کو بزمانۂ قید مالٹا پیش آئے۔ مولانا کا ایثار، صبر و استقلال کسرنفسی اور فروتنی اُن کی حُبّ اسلام اور حبّ قوم سے اب بچہ بچہ واقف ہی۔ اگرچہ اُن کی پاک سیرت اور فضائل اور اخلاق حسنہ سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جنھیں اُن کی صحبت میں رہنے اور اس سے فیض پانے کا موقع ملا ہی۔ لیکن دینی علوم کی درس تدریس اور اشاعت اور آخر زمانہ میں مسلمانوں کو راہ مستقیم پر قایم رکھنے میں جو سعی انھوں نے فرمائی وہ سب پر آشکارا ہی۔ خصوصاً وہ زمانہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے جب کہ زندگی کے آخر ایّام میں جو اُن کی ضعیفی کا عالم تھا اور قید مالٹا نے انھیں بالکل مضمحل کردیا تھا وہ بیماری اور تکلیف کی حالت میں جگہ جگہ لوگوں کو تلقین اور ہدایت کرتے پھرے اور اپنے راحت و آرام کو قومی خدمت پر تصدق کردیا اور اِسی میں جان دیدی۔ ایسی بےنفس، بےلوث اور پاک زندگی کے حالات پڑھنے کے قابل ہیں۔ اس کتاب میں زیادہ تر حالات مولانائے مرحوم کے سفر اور خصوصاً قید کے لکھے ہیں جو بہت دلچسپ اور پر عبرت ہیں۔ حاجی مولانا حسین احمد صاحب نے جو مولانا کے صادق رفیق اور خادم اور شریک قید تھے اِن تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ دلکش طریقہ سے لکھا ہی۔ اور اِسی ضمن میں بہت سے حالات ترکوں، عربوں، مصریوں کے اور دوسرے واقعات بھی آ گئے ہیں۔ ہم نے اسے بہت شوق سے پڑھا اور ہمیں اُمید ہی کہ ہر شخص اسے شوق سے پڑھے گا اور فائدہ اُٹھائے گا۔[1]

داغ جگر

یہ جناب علی سکندر صاحب جگرؔ مرادآبادی کی غزلیات کا مجموعہ ہے جو سلسلۂ بزم ادب کی طرف سے شائع ہوا ہے اور مرزا احسان احمد صاحب بی اے۔ ال ال بی (علیگ) نے مرتب فرمایا ہی شروع میں دو صفحہ کا دیباچہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے جو بزمِ ادب کے صدر ہیں لکھا ہی۔ بزم ادب کی یہ پہلی کتاب ہی جو شایع ہوئی ہی۔

---

[1] خلافت عثمانیہ دارالاشاعت والتجارت۔ دیوبند۔ قیمت (عہر)

حضرت جگرؔ کے کلام سے غالباً اکثر لوگ واقف ہوں گے۔ لیکن اُن کی شاعری کی اصل حقیقت اِس مجموعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ مرزا احسان احمدؔ صاحب نے اُن کی شاعری پر اِس مجموعہ کے ابتدا میں ۴۹ صفحہ کا زبردست مقدمہ لکھا ہے۔ مرزا صاحب حضرت جگرؔ کے بیحد قدرداں ہیں۔ وہ اپنے مقدمہ کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔

"یہ ایک نہایت افسوسناک واقعہ ہے کہ وہ شخص جس نے اپنی قوتِ تخیل سے تغزل کو ایک پیکرِ اعجاز بنا دیا ہے، جو سطحی اور عامیانہ جذبات کے حدود سے گزر کر قلب انسانی کے ان حسیات مخفیہ کو بے نقاب کرتا ہے جو ہمیشہ اربابِ ذوق کے لئے سرمایۂ حیات رہی ہیں، جس کا ایک ایک حرف جوشِ محبت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے جس کا ایک ایک شعر اسرارِ فطرت کا ایک مقفل خزانہ ہے، جس کی ایک ایک ادا عشق کی مستانہ کیفیتوں سے لبریز ہے، ادبی دُنیا اب تک اُس کی حقیقی شاعرانہ عظمت سے نا آشنا ہے۔"

اور مقدمہ کے آخر میں فرماتے ہیں "میرا یہ دعویٰ ہے کہ تغزل کے لحاظ سے اِس وقت کوئی اُن کا ہمسر نہیں" مرزا صاحب کی یہ قدردانی دیکھکر جی خوش ہوتا ہے۔ دنیا میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ لیکن ایسے قدرداں مشکل سے ملتے ہیں۔ اور اسی قدردانی کا نتیجہ ہے کہ یہ غزلیں گمنامی سے بچ گئیں اور قدرشناسوں تک پہنچیں۔ گو مرزا صاحب کی رائے مبالغہ سے خالی نہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت جگرؔ کا کلام ہے بھی قابلِ قدر۔ اُن کا رنگ عاشقانہ ہے تغزل کے کوچہ میں بے تکلف ہیں، زبان صاف اور فصیح ہے، ابتذال نام کو نہیں۔ طبیعت میں کسی قدر جدت بھی ہے اگرچہ مضامین وہی ہیں جو ہم دوسرے دیوانوں میں دیکھتے ہیں، مگر کبھی کبھی اسلوب بیان میں نزاکت پیدا کر جاتے ہیں۔ جو لوگ عاشقانہ کلام کے دلدادہ ہیں وہ جگرؔ صاحب کے کلام سے ضرور لطف اُٹھائیں گے۔ حضرت جگرؔ داغؔ کے شاگرد ہیں اور داغ کا اثر اُن کے کلام میں نظر آتا ہے۔ کلام کی قدر کلام پڑھنے ہی سے ہوتی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار لکھے جاتے ہیں ؎

لحظہ بھر جل لئے پروانے تو کیا حاصل ہے ۔۔۔ شمع جس شان سے جلتی ہے بہت مشکل ہے

سمجھے تھے جسے ہم آرزو ہے ۔۔۔ معلوم یہ اب ہوا کہ تو ہے

صیاد اگر ہو سُننا شوخی مری زباں کی ۔۔۔ رکھدی قفس میں لاکر اِک شاخ آشیاں کی

خزاں کا دور وہ پژمُردہ غنچے، گُل وہ افسردہ ۔۔۔ چمن لٹتا تھا یارب یا کوئی خوابِ پریشاں تھا

دلِ پُر داغ کی ویرانیوں کا واہ کیا کہنا | کہ گلشن کا تھا گلشن اور بیاباں کا بیاباں تھا
جسے اے یاس ٹھنڈا کر دیا تیری عنایت نے | وہی اِک داغ دل تو زینتِ شامِ غریباں تھا

طلبِ خلد نہیں آرزوئے حور نہیں | تم جو مل جاؤ تو پھر کچھ مجھے منظور نہیں
اللہ اللہ ری یہ رنگِ حقیقت کی بہار | میں سمجھتا تھا کہ یہ فاصلہ کچھ دور نہیں
شوق بیتاب کہ کہہ چلئے غمِ عشق کا راز | شرم مانع کہ محبت کا یہ دستور نہیں
دل کے ہو تے ہوئے جاتے ہو کہاں اے موسیٰ | اس میں کچھ جلوے ہیں ایسے جو سرِ طور نہیں

سراپا آرزو ہوں، درد ہوں، داغ تمنّا ہوں | مجھے دُنیا سے کیا مطلب کہ میں آپ اپنی دنیا ہوں
کبھی کیفِ مجسّم ہوں کبھی شوقِ سراپا ہوں | خدا جانے کہ کس کا درد ہوں کس کی تمنّا ہوں
مجھے جنبش میں کیا لائے گی موجِ صرصرِ عالم | حریم قدس کہتے ہیں جسے میں اُس کا پردا ہوں
مجھی میں حسن کا عالم مجھی میں عشق کی دُنیا | نثار اپنے پہ ہو جاؤں اگر سو بار پیدا ہوں

اللہ اللہ ری وارفتگیِ عشق مری | اس جگہ ہوں کہ جہاں حسن بھی دیوانہ ہے

مجھے جو عرضِ تمنا پہ کچھ حجاب آیا | مرے سوال کی شرمندگی سوال ہوئی[1]

شاعری کی تیسری کتاب

یہ کتاب خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی تصنیف ہے جس میں اُردو زبان کے قوافی اور عیوب قافیہ کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس سے قبل خواجہ صاحب شاعری کی پہلی اور دوسری کتاب لکھ چکے ہیں جن میں فن عروض کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں قافیہ کا بیان تفصیل کے ساتھ اس طرح لکھا ہے کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے مثالیں بھی جا بجا کثرت سے دی ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ دوسرے خواجہ صاحب نے خواہ مخواہ عرب و عجم کی تقلید نہیں کی بلکہ شعرائے ہند کے استعمال کو ملحوظ رکھکر قواعد مرتب کئے ہیں۔ جو لوگ اُردو شاعری سے ذوق

---

[1] کتاب غالباً ناظم بزم اُردو اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

رکھتے ہیں اور قافیہ کی پیچیدگیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں، اُن کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہوگی۔[۱]

شاہزادہ یوذاسف وحکیم بلوہر

یہ کتاب ڈاکٹر میرزا صفدر علی صاحب مرحوم کی تالیف (یا ترجمہ) ہی اب پانچویں بار طبع ہوئی ہی۔ نصاب تعلیم میں بھی یہ کتاب رہ چکی ہی۔ ایک اخلاقی قصہ ہے اور حکمت ونصائح سے مملو ہی۔ زبان صاف اور ستھری ہی۔ لڑکے لڑکیاں اور بڑی عمر کے شخص سب بلا تکلف پڑھ سکتے ہیں۔[۲]

تجارت کی دوسری تیسری اور چوتھی کتاب

اس سے قبل تجارت کی پہلی کتاب پر تبصرہ ہو چکا ہی۔ اسی سلسلہ میں یہ تین کتابیں۔ دوسری اور تیسری کتاب مولوی سید ظہور احمد صاحب وحشی کی تالیف ہیں اور چوتھی "ماہر علم تجارت" جناب سید صغیر علی صاحب قادری کی لکھی ہوئی ہی۔ یہ تینوں کتابیں نظامیہ دارالاشاعت دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ پہلی کتاب کی طرح دوسری اور تیسری پر بھی خواجہ حسن نظامی صاحب کے دیباچے ہیں اور یہ کتابیں انھیں کی تحریک سے لکھی بھی گئی ہیں۔

تجارت کی دوسری کتاب میں " فن اشتہار" کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہی اور اشتہار لکھنے، اشتہار دینے، اشتہار کے فوائد، اشتہار کے رسم الخط اور اشتہار کی مختلف صورتوں کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

تیسری کتاب میں دوکانداری کا ذکر ہے۔ اس میں سرمایہ، دکان کا موقع، مال کی خریداری، دکان کی آراستگی قیمتوں کے تعین، طریق فروخت، گاہکوں سے تعلقات، دکان کو ترقی دینے کے وسائل، سرمایہ بڑھانے اور رجسٹروں کی ترتیب سے بحث کی گئی ہی۔

چوتھی کتاب زیادہ ضروری اور کارآمد ہی اس میں مشرقی اور مغربی تجارتی خط وکتابت کے عام فہم علمی اور عملی اصول بیان کئے ہیں اور ہر قسم کے تجارتی وکاروباری خطوط کے نمونے دے کر اردو اور انگریزی زبان میں تجارتی

---

[۱] ملنے کا پتہ:- خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت۔ احاطۂ خانساماں۔ لکھنؤ۔ قیمت (۸/) (صفحات ۴۸)

[۲] ملنے کا پتہ:- مینجر الناظر صغرا منزل۔ تالاب مان صاحب قیمت (عہ/) (صفحات ۱۳۱)

خطوط اور تار لکھنے اور بل وغیرہ بنانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوکانداروں اور تاجروں کے لئے بہت مفید ہی۔ مؤلف فن تجارت کے سند یافتہ اور کامیاب صاحب ہیں۔[۱]

مثنوی مشہور عالم سلطانہ رضیہ بیگم

یہ نئی مثنوی صدر الدین صاحب صدر قصوری نے اپنے والد مرحوم کی یادگار میں لکھکر شائع کی ہی۔ اس میں ڈیڑھ ہزار سے بھی زیادہ شعر ہوں گے۔ چھوٹی تقطیع کے ۸۰ صفحے پر اچھی صاف چھپی ہے اور غالباً خود مصنف سے ۸ر قیمت پر دستیاب ہو سکتی ہی۔

مثنوی کا موضوع سلطان شمس الدین کی بیٹی رضیہ سلطان کا عہد حکومت ہی جو کئی سال تک تخت دہلی پر بادشاہی کرتی رہی اور مصنف نے جس قدر تفصیل سے بعض حالات لکھے ہیں وہ بہت قابل قدر ہی اگرچہ انھوں نے اپنی تاریخی ماخذ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ ہمیں امید ہی کہ صدر الدین صاحب اس قسم کی تصنیفات کا سلسلہ آیندہ بھی جاری رکھیں گے لیکن ہمارا مشورہ یہ ہی کہ نظم کی دشواریاں سر لینے کے بجائے وہ اپنے تاریخی مضامین کے واسطے سیدھی سادی نثر کی کتابیں لکھنے پر اکتفا فرمائیں کیوں کہ ہمیں اندیشہ ہی کہ اُن کی نظم لوگوں میں مقبول نہ ہوگی اور عجب نہیں کہ نکتہ چینوں کی نظر میں موجب طعن و تضحیک قرار پائے اور اس پر بھی اس قسم کی تنقیدیں لکھی جائیں جیسی کہ دیوان حافظ کے منظوم ترجموں پر رسالہ نقیب میں لکھی گئی تھیں نظم کا نمونہ دیکھنے کے لئے مثنوی کے پہلے ہی چار شعر حمد میں یہ ہیں ؎

بنامِ خالقِ یاقوت و مرجاں ۔۔۔ رضیہ خاطرِ مخلوق قرباں

ہی ذاتِ پاک نورِ عدل و الطاف ۔۔۔ جہاں میں جو کہ پھیلا ہی ہر اطراف

ہیں سب اس نور کے امر و نہی عدل ۔۔۔ ہی موجودات کا مقصد یہی عدل

نظامِ آفرینش ہے رہا جھول ۔۔۔ ترازوئے عدالت اس کی ہی چول

---

[۱] ملنے کا پتہ :- منیجر نظامیہ دار الاشاعت دہلی۔
دوسری کتاب مجلد ۹ر غیر مجلد ۸ر تیسری کتاب مجلد ۸ر غیر مجلد ۱۲ر چوتھی کتاب کی قیمت درج نہیں۔

اُردو کے نئے رسالے

(۱) الانعام

یہ رسالہ محمد اسد اللہ خاں صاحب اسدؔ کی اڈیٹری میں ملتان سے شائع ہوا ہی۔ اِس نے اپنا مقصد یہ رکھا ہی کہ اُردو میں سائنس کے دلچسپ مضامین شائع کرے۔ لیکن چند وجوہ سے خالص سائنس کا رسالہ بنانا مناسب معلوم نہوا۔ اِس لئے اس میں ایک حصّہ ادب کا بھی ہوگا۔ نظم بھی ہوگی لیکن مبتذل عاشقانہ نظمیں درج نہوں گی۔ لطائف و ظرافت کی بھی چاشنی ہوگی اور تفریح وتفنن کے تحت میں "چھوٹے چھوٹے چٹکلے، لطیفے، اشعار اور ظریفانہ مضامین درج ہوا کریں گے"۔ یہ رسالہ کا پہلا نمبر ہے جو اکتوبر میں شائع ہوا۔ اِس میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ رسالہ کا مقصد بہت اچھا ہی اگر وہ اس میں کامیاب ہوا تو اُردو داں طبقہ کے لئے بڑی نعمت ہوگی۔ اس سے پہلے نمبر میں کوئی ایسا مضمون نہیں ہی جو تحقیق سے لکھا گیا ہو۔ البتہ سائنس کی ایجادات و اختراعات کے متعلق بہت سی نئی معلومات ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں[1]۔

(۲) شفق

یہ نیا اُردو کا ماہوار رسالہ ہی جو مہاجر صاحب کی اڈیٹری اور مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب ایم۔ اے کی زیر سرپرستی مدراس سے شائع ہوا ہی۔ یہ پہلا نمبر ہے جو ماہ ستمبر میں شائع ہوا۔ اِس کا مقصد اڈیٹر صاحب نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہی۔

> "شفق کا مقصد واحد اُردو زبان کی اشاعت اور ترقی ہے وہ اپنی استطاعت کے موافق سعی کرنے میں دریغ نہ کرے گا۔
>
> جنوبی ہند کی مُروّجہ وقت اُردو کی اصلاح وترمیم کا خیال اِس کے اسی مقصد میں خصوصیت کے ساتھ شامل ہوگا، ماضی وحال کے علوم متنوعہ عام اس سے کہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی اور بالخصوص علوم اسلامیہ اور مشاہیر اسلام کے کارنامجات قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے پیش کئے جائیں گے"۔

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ انعام۔ لوہاری دروازہ۔ ملتان۔ چندہ سالانہ (ع۴) حجم ۴۸ صفحے۔

شروع میں پروفیسر محمد نعیم الرحمن صاحب کا فوٹو دیا ہے۔ مضامین اوسط درجہ کے ہیں۔ کچھ علمی ہیں اور کچھ عام دلچسپی کے۔ چند غزلیں اور نظمیں بھی ہیں۔ رسالہ کا مقصد بہت اچھا ہے۔ مدراس میں اُردو کی اشاعت کی بہت ضرورت ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ اس رسالہ سے اُردو زبان کی اشاعت اور اصلاح میں بہت کچھ مدد ملے گی۔ غالباً مدراس میں اُردو کے اچھے مطبع نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ لکھائی اور چھپائی اچھی نہیں ہے۔ سالانہ چندہ چار روپیہ ہے۔

(۳) ترقی

یہ رسالہ حیدرآباد (دکن) سے شائع ہوا ہے۔ اڈیٹر صاحب نے اپنے عرضِ حال میں اس کا مقصد یہ قرار دیا ہے۔

"ترقی ایک طرف ارض مغرب کی ترقیات اور جدید علوم و فنون کو روشنی میں لائے گا اور اہلِ ملک کو بتائیگا کہ یورپ کی ترقی کا سرمایہ کیا ہے اور اُس نے کس طرح آج یہ رُتبہ حاصل کیا۔ اکتشافات جدیدہ کی حقیقت سے اہلِ ملک کو باخبر بنائے گا تو دوسری طرف ہمارے قدیم علمی اور اخلاقی روحانی برکتوں کو زندہ رکھنے کے لئے جس کی موجودہ زمانہ میں شدید ضرورت نظر آرہی ہے سعی و کوشش کرے گا۔ اس طرح وہ دین و دُنیا کے فوائد جمع کرنے والا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب و تمدّن آریائی و غیر آریائی دونوں کو روشنی میں لائے گا۔ مختلف اقوام نے اپنے اپنے دَور میں جن علوم و فنون کو ترقی دی اُس کو اچھی طرح واضح کرے گا۔ اور قدیم تاریخ و صنائع و عمارات کے متعلق جن پر آج یورپ بھی محوِ حیرت ہے ہر طرح مواد مہیا کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ ملک کی مشترکہ زبان اُردو کا صحیح رواج نہایت وسیع پیمانہ پر پھیلے جو ملک کی ترقی کا بڑا آلہ ہے اِس طرح وہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کی دلچسپیوں کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کرے گا۔"

یہ مقصد بہت اعلیٰ اور مستحسن ہے مگر پہلے نمبر سے یہ توقع پُوری نہیں ہوتی۔ اِس میں تین چھوٹی نظمیں اور تین نثر کے مضمون ہیں اور تینوں اوسط درجہ کے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فرمایشوں سے تنگ آکر لکھ دیئے ہیں ہمیں اُمید ہے کہ اڈیٹر صاحب خود بھی اِس میں محنت کریں گے اور اسے حیدرآباد کی شان کے شایاں بنانے میں کوشش فرمائیں گے۔ یہ رسالہ ۷۴ صفحوں پر ہے اور قیمت سالانہ پانچ روپیہ ہے۔

(۴) خورشید

یہ ایک چھوٹی تقطیع پر ۳۲ صفحہ کا رسالہ ہی اور اسے شائع ہوتے ہوئے گیارہ مہینے ہوتے ہیں۔ پہلے میں ساڑھے تین صفحوں پر نثر کے مضامین ہیں جن کا تعلق زبان اور شعر و شاعری سے ہی۔ چودہ صفحوں پر طرح کی غزلیں ہیں اور باقی صفحات پر غیر طرح غزلیں درج ہیں۔ اڈیٹر پیرجی عبدالجید زاہدی صدیقی ہیں۔ محلہ مشائخان میرٹھ سے شائع ہوتا ہی۔ قیمت سالانہ (عہ)

فرمانِ نبوّت

اِس کتاب میں مولوی عبدالجلیل صاحب نعمانی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نامجات کو مختلف کتابوں سے تلاش کر کے جمع کر دیا ہی اور اُن کے ساتھ صاف اُردو ترجمہ بھی لکھدیا ہی یہ کل نامجات تعداد میں ۵۵ ہیں کتاب حاجی محمد عبدالحفیظ صاحب محلہ سلطان پورہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہی۔

قاضی بدرالدولہ مرحوم

و

مولوی محمد باقر آگاہ

یہ دو رسالے مولوی فاضل محمد مرتضےٰ صاحب کی تالیف ہیں۔ پہلے رسالہ میں جو ۹ صفحہ کا ہی قاضی بدرالدولہ امام العلما قاضی الملک مولوی محمد صبغۃ اللہ کا مختصر تذکرہ ہی۔ قاضی صاحب کا خاندان عربی النسل تھا اور ان کے بزرگوں نے عرب سے آکر جنوبی ہند میں توطن اختیار کیا اور ۵ پشت سے مسلسل مذہب کی علمی خدمت میں مصروف رہا۔ قاضی صاحب مرحوم ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۰ھ میں انتقال فرمایا۔ عربی فارسی اردو میں بکثرت تصانیف ہیں اور بعض کتابیں جنوبی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ اردو ان کی پرانی وضع کی دکنی ہی۔ مثالاً چند سطریں

نقل کی جاتی ہیں۔

"پھر دل چاہا کہ حسب خواہش اس غریق رحمت کے رسالہ کو بسط کروں لیکن دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہوگیا ہے اور علم جاننے والے دنیا سے گزر گئے اب کوئی کتاب زبان عربی یا فارسی میں تصنیف کئے تو کچھ فائدہ اس پر مترتب نہیں۔"

دوسرا رسالہ مولوی محمد باقر آگاہ مرحوم کے حالات میں ۵ صفحات پر ہے۔ ان بزرگ کا خاندان بھی عرب سے سواحل ہند پر آکر آباد ہوا۔ یہ بمقام ویلور ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۲۰ھ میں انتقال کیا مولوی صاحب مرحوم مولانا آزاد بلگرامی کے ہمعصر تھے۔ عربی اور فارسی کے بڑے ادیب اور عالم تھے۔ مگر زیادہ تصانیف دکنی زبان یعنی اردو میں ہیں اور بیشتر حصہ نظم میں ہے۔ یہ تمام تصانیف مذہبی مباحث پر ہیں۔ ان کی اردو کا رنگ ذیل کی چند سطروں سے معلوم ہوگا۔

"اس اثنا میں بعض دوستاں واسطے دوسرے رسالوں کے بولے۔ پن اتفاق ان کے بنانے کا نہیں ہوا۔ ... ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں اے بھائی یہ رسالے دکنی زبان میں ہیں کر کر سہل اور سرسری نجان کیا واسطے کہ بڑے معتبر کتب سے تحقیق کر کر لکھا ہوں۔"

یہ رسالے مولوی محمد عبدالسلام صاحب شریک معتمد انجمن طلبۂ قدیم دارالعلوم مخدوم پورہ گلبرگہ سے مل سکتے پہلے کی قیمت ایک آنہ چھ پائی دوسرے کی دو آنہ ہے۔

تذکرہ میر حسن دہلوی

میر حسن دہلوی مصنف بدر منیر کا "تذکرہ شعرائے اردو" جو نایاب تھا انجمن ترقی اردو کی طرف سے چھپ کر شائع ہوگیا ہے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت فی جلد مجلد عہ۱ اور غیر مجلد عہ

تصحیح

افسوس کہ "المسیح" کے تبصرہ میں جو ماہ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے رسالہ میں شائع ہوا ہے، ایک بڑا سہو ہوگیا۔ یعنی یہ لکھا گیا کہ رسالہ کے مدیر حکیم عبداللطیف صاحب شادانی ہیں۔ حالانکہ اس کے مدیر زبدۃ الحکما حکیم محمد کبیر الدین صاحب پروفیسر تشریح و مؤلف مکملہ تالیفات طبیہ کالج دہلی ہیں۔

(اڈیٹر)



مطبوعاتِ انجمن

تاریخ تمدن - سرٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے۔ اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

حصہ اول عہ کلدار حصہ دوم عا ر کلدار

مقدمات الطبیعات - یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلی کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے، لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے۔ عا ر کلدار

القول الاظہر - امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف فوز الاصغر کا اردو ترجمہ ہے یہ کتاب فلسفۂ الٰہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے۔ قیمت عہ ر کلدار۔

رہنمایان ہند - مشہور کتاب ہیروفیٹس اوف انڈیا کا ترجمہ ہے، ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان - فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج گوتم بدھ وغیرہ کے حالات ہیں عہ ر کلدار

القمر - قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں اُن سب کو جمع کر دیا ہے، طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے۔ ۱۰ ر کلدار

البیرونی - کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے، دسویں صدی کا فاضل ہے - مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے، البیرونی اس کے حالات زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد عا ر کلدار

قاعدہ و کلید قاعدہ - یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیے ان کی تشریح کے لیے ایک کلید بھی تیار کی گئی ہے۔ قاعدہ ۲ کلدار کلید قاعدہ ۴ ر کلدار

فلسفۂ تعلیم - ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے، غور و فکر کا بہترین کارنامہ والدین و معلم کے لیے چراغِ ہدایت ہے تربیت کے ربانی قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے، اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت ۱ عہ ر کلدار

نپولین اعظم۔ ایبٹ کی مستند کتاب کا اُردو ترجمہ، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بھر جدوجہد کا آخری باب ہے واقعات کی داد یا تو سکندر کی زبان ادا کر سکتی ہے یا تیمور کی زبان۔ ترجمہ آسان اور عام فہم ہے، قیمت ۵ کلدار

دریائے لطافت۔ ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اُردو صرف و نحو اور محاورات والفاظ کی پہلی کتاب ہے، اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں، قیمت عہ کلدار

طبقات الارض۔ اس فن کی پہلی کتاب ہے تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلمبند کیے ہیں کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت عا کلدار

مشاہیر یونان و روما۔ ترجمہ ہے، سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے، ادبیان عالم بلکہ شیکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے، وطن پرستی بے نفسی عزم و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے جلد اول غیر مجلد (عہ) کلدار جلد دوم مجلد عہ کلدار

اسباق النحو۔ ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بی۔ اے کی تالیف ہے اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔ قیمت ۴ر کلدار

علم المعیشت۔ اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے، معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مشکل و مبہم مسائل کو پانی کر دیا گیا ہے۔ اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں، اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔ حجم ۸۲۵ قیمت مجلد صہ کلدار

تاریخ اخلاق یورپ۔ اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر، تحقیق و صداقت کا مرادف ہے یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن معاشرت، اصول اخلاق مذاہب و خیالات کا مرقع ہے حصہ اول (عہ) حصہ دوم مجلد عاہ کلدار

تاریخ یونانِ قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلباء جو یونانی قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے مجلد عاہ کلدار

انتخاب کلامِ میر۔ میر تقی میر تاج شعرائے اُردو کے کلام کا انتخاب ہے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۵۴ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ قیمت عاہ کلدار۔

رسالہ نباتات - اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی اصطلاحات سے معرا، سلاست و روانی سے مملو اور دلچسپ و مفید ہی، طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں۔ قیمت مجلد عمہ کلدار

دیباچہ صحت - اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا پانی، غذا، لباس، مکان وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہی، زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دل پذیر ہی، ملک کی بہترین تصنیف ہے اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا، حجم ایک ہزار صفحے قیمت مجلد للعہ

قواعد اُردو - ارباب فن کا اتفاق ہی کہ اُردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہی کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہی۔ قیمت عہ کلدار

نکات الشعرا - یہ اُردو شعرا کا تذکرہ استاد الشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہی، اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں، نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہی۔ قیمت مجلد عہ کلدار

فلسفہ جذبات - کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہی جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہی متعلمان نفسیات اسے نہایت مفید پائیں گے۔ مجلد کلدار غیر مجلد عہ کلدار

وضع اصطلاحات - یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہی بقول فاضل مولف یہ بالکل نیا موضوع ہی۔ میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب آج تک نہ یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہی نہ ایشیا کی کسی زبان میں اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہی اور اُس کے اصول قائم کیے گئے ہیں۔ مخالف موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے۔ اور زبان کی ساخت اُس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں اُردو مصادر اور اُن کے مشتقات غرض سینکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں۔ اُردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہی کہ زبان میں اُن کی نظیر نہیں لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں اور ہمارے حوصلے بلند کر دیے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اُردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اُس کی آئندہ ترقی کے متعلق دعوے کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔

اس نے حقیقت کا ایک باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے۔ تعداد صفحات ۵۰۴ قیمت مجلد ۱۲ روپے کلدار

نفح الطیب ۔ یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اسکی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے علامہ مقریزی کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اُردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۴۰۶ قیمت مجلد ۳ روپے کلدار

محاسن کلام غالب ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا صاحب نظر قدردانوں کے اصرار سے الگ طبع کیا گیا ہے۔ غیر مجلد قیمت عہ کلدار

دیوان غالب جدید و قدیم یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا اس میں میرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے میرزا صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آ گیا اور ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے معہ مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن۔ غیر مجلد للعہ، مجلد صہ کلدار (بلا مقدمہ غیر مجلد عہ، کلدار مجلد ہیے کلدار)

ملل قدیمہ ۔ ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں بعض قدیم اقوام سلطنت کلدانی، آشوری بابل بنی اسرائیل وفینقیہ کی ان کی معاشرت عقائد، صنعت وحرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیتے ہیں۔ اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اسی لیے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے۔ حالات کی وضاحت کے لیے جابجا تصویریں بھی دی گئی ہیں صفحہ ۷۰۴ قیمت عا کلدار

بجلی کے کرشمے ۔ یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خانصاحب بی۔ اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے، اور سہل زبان میں لکھی ہے۔ ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے کہاں سے آتی ہے کیا کیا کام آسکتی ہے۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے لیے بھی مفید ہے مجلد قیمت عا کلدار

ملنے کا پتہ :۔ صدر دفتر انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبانِ ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

۳۔ قیمت ۷ روپیے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک اور ارکانِ انجمن ترقی اُردو سے آٹھ روپیے بارہ آنے۔

۴۔ تمام خط و کتابت آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد سے ہونی چاہیے۔

(باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی مُسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)

کتب خانہ
جامعہ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس تعلیمات، مجلس انتظامی، مجالس تعلیمات و نصاب پانچ کتابیں ایک وقت میں [illegible] اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیات [illegible] ایک ماہ تک [illegible] اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

اور اراکین دار الترجمہ دس کتابیں [illegible] ایک وقت میں [illegible] رکھ سکتے ہیں۔

۳۔ طلبا ایم اے، ایل ایل بی [illegible] تین کتابیں ایک وقت میں اپنے پاس [illegible] رکھ سکتے ہیں۔ [illegible] طلبہ [illegible] کتابیں [illegible]

۴۔ مدت مقررہ [illegible] کتاب [illegible] واپس [illegible] جرمانہ [illegible]

۵۔ [illegible] کتاب کا [illegible] لازم ہے۔

۶۔ [illegible] کتابوں [illegible]

۷۔ کتابوں [illegible]

۸۔ [illegible]